بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب
شمارہ دسمبر-2024 جلد نمبر 17
Tahreek-e-adab vol-17, issue-84 December 2024

Editor مدیر
Jawed Anwar (Dr.Jawed Ahmad) جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد)
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت
Editorial board and Peer Review committee
پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.
پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی
Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University
ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)
پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی
Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)
پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)
ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا
Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata
ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-17(جلد نمبر 17) Year of Publication 2024 سال اشاعت:

Issue November 2024،دسمبر-84 شمارہ، شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط:انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین سرورق :

200/-Two Hundred rs. per copy دوسوروپے : فی شمارہ

زر سالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زرِ رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through

cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping

centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔طواف زیارت، حرم شریف کو روانگی اور قیام، طواف الوداع اور لندن واپسی
الوداع مکہ اور مقدس زمین، باب آخر (کتاب دل) نجمہ عثمان 5
2۔میں خطاوار تو بخشنہار، دل دریا بہتا جائے
بے لباس آئینے (میں زندہ آدمی ہوں) خالد حسین 21

افسانے:

1۔دورنگوں کی کہانی نور شاہ 45
2۔آنسو کیوں؟ وحشی سعید 48
3۔میں کیا کروں ڈاکٹر نذیر مشتاق 51

مضامین:

1۔شاہد نقوی کی مرثیہ نگاری اشتیاق احمد 55
2۔عوامی انتظامیہ کا بنیادی جزو کے طور پر
اخلاقیات اور سالمیت ڈاکٹر جنید خان 62
3۔عزیز اللہ شیرانی: بحیثیت طنز و مزاح نگار ڈاکٹر محمد مستمر 69
4۔ہندوستانی جمہوریت میں تعلیم کے نمایاں پہلو ڈاکٹر شفاعت احمد 80
5۔جوش ملیح آبادی: ایک انقلابی شاعر ڈاکٹر عرسہ یاسمین زیبا 84
6۔فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ ڈاکٹر شمشاد فاطمہ 89
7۔علمی مثبتیت: تعلیمی اداروں میں کامیابی کی بنیاد ڈاکٹر شیخ وسیم، ڈاکٹر ثمینہ بسو 92
8۔لسانی آموزش کے متعلق نفسیاتی لسانیاتی نظریات: ایک تعارف امتیاز احمد 103
9۔جدیدیت کی فکری جڑیں: چند مباحث ڈاکٹر محمد ساجد عالم 115
10۔دکن پر فارسی ثقافت کے اثرات: ایک تجزیاتی مطالعہ سعید الرحمٰن 121
11۔حامدی کاشمیری کی فکشن نگاری اختر احمد ملک 127
تسکین گروپ آف پبلی کیشن اور انجمن فروغ اردو جموں کے اشتراک سے
بیاد فاروق ناز کی 2024 اعزازی تقریب کا انعقاد 131

Tawafe ziyarat,Haram Sharif ko rawangi aur qayaam,tawaafe alvida aur London wapsi, alvida makka aur muqaddas sar zameen, Baabe Aakhir (Kitabe dil) by Najma Usman (Surrey,U.K)cell-00447936911711

نجمہ عثمان (سرے، یو۔کے)

طواف زیارت

حج کے دوران ایسے کئی لوگ ملے جو کسی نہ کسی شکل میں دوسروں کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے اور پھر کبھی نظر نہیں آئے۔ خیالات کی رو میں، میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا نکلی تھی۔ اپنے کمرے میں لوٹی تو یہی سوچیں ساتھ چلی آئیں۔ تھوڑا سا آرام کیا۔ دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کے بعد میں اور زبیر باہر نکلے۔ باہر نکلتے ہی ایک سعودی جوڑا مل گیا وہ بھی طواف کے لیے جا رہے تھے، ہم نے سوچ مل کر ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی عربی کے علاوہ تھوڑی بہت انگریزی بھی بول سکتے تھے اس لیے رابطے میں بھی آسانی ہوگئی۔ انہوں نے ایک ٹیکسی والے سے عربی میں بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد 150 ریال میں معاملہ طے کر لیا۔ یہ بھی طے پایا ہم کرایہ آدھا آدھا دیں گے۔ ہماری ہم سفر خاتون زیادہ تر خاموش رہیں، ان کے میاں خاصے باتونی تھے، بتانے لگے کہ انہوں نے کئی ملکوں کا سفر کیا ہے۔ لندن، نیویارک، سنگاپور وغیرہ۔ ان میں سنگاپور، جاپان اور کوریا بہت اچھے ممالک ہیں کیونکہ وہاں تحفظ ہے، لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔ میں سوچ میں پڑ گئی کتنی عجیب بات ہے، کسی بھی ملک کا باشندہ ملے سب اپنے اپنے طور پر تحفظ کے خواہش مند ہیں۔ اب لندن کی ہی مثال لے لیں۔ یہاں کے اکثر باشندے بھی باہر سے آنے والوں کے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار تعلق رکھتے ہیں۔

قریب سے کوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی نکلی تو میں اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر آئی۔ وہ صاحب ابھی تک اپنا سفرنامہ سنا رہے تھے۔ میں نے خاتون سے پوچھا ’آپ نے بھی یہ سارے سفر کئے ہیں‘۔ نقاب کے پیچھے سے مسکرا کر بولیں ’میں ساتھ نہیں جاتی یہ اکیلے جاتے ہیں‘۔ آواز میں ایک حسرت، درد یا کرب شاید میں نے ہی محسوس کیا۔ حرم شریف پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ سعودی جوڑا طواف کے بعد جدہ جا رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ رش کم تھا، ہم نے اللہ کا نام لیتے ہوئے نیچے ہی طواف شروع کر دیا۔ لوگ اس وقت

نسبتاً کم تھے، پھر بھی زبیر مجھے سب سے آخری گھیرے میں لے کر چلتے رہے۔ میں بار بار کعبہ شریف کے پاس جانا چاہتی تھی اور زبیر مجھے واپس لے آتے تھے۔ انہیں فکر تھی کہ اگر میں کسی سوڈانی یا لمبے چوڑے گروپ کی زد میں آ گئی تو دھکے لگنے سے گر سکتی ہوں، اور طواف کے دوران زمین پر گرنے والا مشکل سے بچ پاتا ہے۔ یوں کہنے کو تو جو بھی قافلہ یا گروپ ہوتا ہے چاہے وہ کورین ہو یا جاپانی ،چھوٹے چھوٹے گروپ کی صورت میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گھیرا بنا کر چلتا ہے۔ ان کے آس پاس جو بھی آئے وہ 'ہٹو بچو سرکار آتے ہیں' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تیز رفتاری سے آتے ہیں کہ لوگ خود ہی ان کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں طواف کے سات چکر ہیں جو حجر اسود سے شروع ہو کر حجر اسود پر ختم ہوتے ہیں۔ کافی عرصے سے یہاں پر سبز بتیاں لگا دی گئی ہیں تا کہ حاجیوں کو اندازہ رہے کہ طواف یہاں سے شروع کرنا ہے، میں نے پہلا عمرہ کیا تھا اس وقت حجر اسود کے سامنے زمین پر ایک سبز لکیر بنا دی گئی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے حاجی نہ صرف رکتے تھے بلکہ اتنے ہجوم میں یکا یک رکنے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے۔ جو ہر کسی کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا تھا۔

اب صورت حال بہت بہتر اور آسان ہے۔ دور سے ہی سبز روشنی نظر آ جاتی ہے اور طواف کرنے والے 'استلام' کرنے کی تیاری کر لیتے ہیں۔ میں زبیر کا ہاتھ تھامے سب سے آخری گھیرے میں طواف کرتی رہی حالانکہ اس وقت رش بہت کم تھا، اس کے باوجود یہ عالم تھا کہ طواف کا تین چوتھائی حصہ تو بہت کم دھکے اور جھٹکے کھا کر گزر جاتا۔ جیسے جیسے دور سے ہری بتی نظر آتی ،طواف کرنے والوں میں نہ جانے کیسا جنون اور جذبہ بیدار ہو جاتا۔ طواف کرنے والے گھیرے سمٹ کر تنگ ہونے لگتے ،نہ چاہتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے اور تیز تیز چلنے والوں کی زد سے بچنا محال ہو جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر کوئی اس سبز روشنی کو سب سے پہلے دیکھ کر اور سلام دے کر گزرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ان لمحات میں دعاؤں کے بیچ اپنا بچاؤ بھی کرنا پڑتا کہ کون کہاں سے روندتا ہوا نکل جائے۔ سب کی ایک ہی منزل تھی، ایک ہی مقصد تھا مگر یہ بھگدڑ، جلد بازی اور افراتفری پھیلانے کا عمل میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ سر جھکا کر پوری محویت سے جو دعائیں یاد ہیں اور جو اپنے بچوں اور اہلِ خانہ دوستوں کے لیے کرنی تھیں وہ کرتی رہوں۔

زبیر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور چھتری بھی تان رکھی تھی۔ دھوپ میں خاصی تپش تھی اور ہجوم کی وجہ سے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ ہوا برائے نام تھی، دیکھا جائے تو ہم سب اس

مبارک فریضے کو انجام دیتے ہوئے اللہ تعالی کے حضور میں حاضر تھے وہ یقینا ہماری خبر گیری کر رہا تھا اور ہمیشہ کرتا ہے۔لیکن بندے بھی نادانی میں یا جذبات کی رو میں بہہ کر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں ۔ہم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے نکلے تھے، اپنا تن من سب اس پر قربان کرنے کے لیے۔لیکن شاید اس کوشش میں حقوق العباد کے فریضے کو پسِ پشت ڈال بیٹھے تھے۔ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اپنا ثواب بٹورتے بٹورتے کہیں ہم دوسروں کی حق تلفی تو نہیں کر رہے۔کوئی بوڑھا ہے،معذور ہے تیز نہیں چل سکتا،ضعیف اور بیمار عورتیں، وہیل چیر پر بیٹھے ہوئے لوگ،کوئی لاٹھی یا بازو کا سہارا لیے ہوئے بزرگ ان کا خیال کرنا،جلد بازی میں دھکا نہ دینا کتنے ثواب کا کام ہے یہ وہ ربِ کریم ہی جانتا ہے۔اپنا روحانی سکھ یا ثواب کمانے کے لیے ہم کسی دوسرے کو چوٹ یا دکھ پہنچائیں یہ درست نہیں۔بہر حال ہر انسان کا فعل اس کے ساتھ ہے اور وہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہے۔میں نے طواف کے دوران جو شدت سے محسوس کیا اسے قلم بند کر دیا۔اللہ تعالی ہم سب کو نیک ہدایت دے آمین۔

ذکر تھا سبز بتی تک پہنچنے کا،اس سے پہلے اچانک مجمع میں جوش آجاتا،رفتار بڑھ جاتی جیسے اس دوڑ میں سب سے آگے نکلنا چاہتے ہوں۔''ربنا اتنا۔۔'' کا ورد بھی جاری رہتا اور کچھ لوگ جذبات میں آکر حجر اسود سے بہت پہلے ہاتھ اٹھا اٹھا کر' سلام'اور'اللہ اکبر' کے نعرے لگانے لگتے۔میرے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم بڑھ جاتا۔میں نظریں نیچی کیے چل رہی تھی کہ کسی دھکے سے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ میں طواف کے کس حصے میں ہوں۔سبز بتی کے بالکل سامنے آکر زبیر مجھ سے کہتے'اب آپ اپنا سیدھا ہاتھ جتنا اٹھا سکتی ہیں اٹھالیں'۔میں ہاتھ اٹھا کر 'اللہ اکبر' کہتی اور جلدی سے ہاتھ نیچے کر لیتی کہ اس بھیڑ میں کوئی ہاتھ ہی نہ لے اڑے۔۔اس علاقے سے نکلنے کے بعد جیسے امن و امان کی فضا قائم ہوجاتی۔لوگ دور دور چلنے لگتے،رفتار بھی مدھم ہو جاتی،دھکوں میں بھی کمی آجاتی اور میں اس پروردگار کا شکر بجالاتی کہ طواف کا ایک اور چکر بخیر و عافیت پورا ہوا۔میں نے اس بھیڑ میں لوگوں کو لڑکھڑاتے ہوئے اور نڈھال ہو کر تقریباً گرتے ہوئے دیکھا۔

الحمد للہ ہم ساتواں چکر لگا رہے تھے۔دعاؤں کی کتاب نکال کر پڑھنے کا حوصلہ تھا نہ گنجائش،جو دعائیں زبانی یاد تھیں وہ پڑھ ڈالیں تمام دوستوں،احباب اور رشتہ داروں نے دعائیں بھیجی ہوئی تھیں جو میں نے احتیاط سے ایک نوٹ بک میں لکھ لی تھیں۔لیکن کوشش کے باوجود انہیں نکال کر پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔کچھ سعودی اور سوڈانی خواتین و حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے کتاب ہاتھوں میں لیے پڑھتے ہوئے طواف کرتے رہے۔جب سبز بتی کے پاس پہنچتے

تھے اور لوگ سمٹ کر قریب ہو جاتے تھے ان لوگوں پر کیا گزرتی تھی، میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں اپنے بچاؤ میں مصروف ہو جاتی تھی۔ جو لوگ حج کے فریضے سے لوٹے ہیں وہ اس کیفیت کا ذکر کرتے ہیں جو اس دوران طاری ہو جاتی ہے۔ رو رو کر دعائیں پڑھنے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے کی کیفیت، یقیناً یہ وہ اللہ کے وہ برگزیدہ بندے ہیں جو ہر حالت میں اللہ سے جڑے رہتے ہیں اور خصوصاً طواف کے دوران انہیں اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہیں ہوتی میں اپنا سچا حال اور کیفیت بیان کر رہی ہوں۔ طواف کے دوران مجھے جب بھی محسوس ہوا کہ میں اللہ سے رابطے میں ہوں اور اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹ کر اس کی ذات سے جڑ رہی ہوں، جبھی کوئی جھٹکا یا کہنی کی ضرب ایسی لگتی کہ میں بلبلا کر آنکھیں کھول دیتی۔ میری بدنصیبی تھی یا میرے مقدر میں وہ لمحات نہیں تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ جو کچھ بھیتھا میرے لیے یہ اعزاز ہی بہت تھا کہ اللہ نے مجھے اس مقدس مقام تک پہنچنے کی سعادت بخشی۔ ساتواں چکر پورا ہونے پر زبیر نے میرا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ گھیرے سے باہر جانا شروع کر دیا، اس طرح ہم کسی کو تکلیف دیے یا پریشان کیے بغیر خیریت سے باہر نکل آئے۔ مقام ابراہیمؑ پر رکنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ بہت رش تھا اور دھکم پیل میں میرے لیے نماز پڑھنی ناممکن تھی۔ طواف کی حدود سے نکل کر زبیر نے ایک مناسب جگہ تاڑ لی جہاں کچھ خواتین پہلے سے کرسیوں پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی وہیں بٹھا دیا اور خود زم زم لینے چلے گئے۔ ہم دونوں نے سیر ہو کر زم زم پیا پھر وہاں بیٹھ کر مقام ابراہیمی کے دو نفل ادا کئے اور دعائیں مانگیں۔ سامنے کعبہ شریف تھا، طواف جاری تھا۔ میں سوچ رہی تھی اللہ تعالیٰ نے دنیا کے سارے سیارے بھی ایک نظام کے تحت بنائے ہیں، سب ایک مدار میں ایک دوسرے کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور یہ نظام تا قیامت یونہی چلتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دے کر اس زمین پر بھیجا۔ ہمیں حج کی سعادت کے دوران اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ حج کا بڑا بڑا حصہ طواف کعبہ ہے سیکنڑوں کی تعداد میں لوگ طواف کرتے ہیں اور منظم طریقے سے سات چکر لگاتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوران طواف ہر کسی کو اپنے سات چکر پورے کرنے اور زیادہ سے زیادہ دعائیں پڑھنے کی لگن ہوتی ہے اور یہ وہ واحد مقام ہے جہاں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، نہ وقت کی پابندی ہے کہ آپ کو اتنے منٹ یا گھنٹوں میں طواف مکمل کرنا ہے۔ جہاں تک حج کے فرائض اور ارکان پورے کرنے کی بات ہے تو یہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے کہ قبول کرے۔ آمین۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اس فریضے کی ادائیگی کے دوران ہم نے کون کون سے حقوق العباد پوری طرح نبھائے، کسی کو

جان بوجھ کے تکلیف نہیں پہنچائی، کسی کا دل نہیں توڑا، جہاں دوسروں کی مدد کر سکتے تھے وہ دل و جان سے کی۔ بہر حال حج کی ادائیگی کی سعادت نصیب ہونی میرے لیے تو ایک معجزے سے کم نہیں تھی۔ الحمدللہ آج یہ فریضہ خوش اسلوبی سے تقریباً مکمل ہونے جا رہا تھا۔ البتہ ایک تمنا تھی جس کا ذکر میں بار بار کر چکی ہوں۔ میں نے دل سے دعا مانگی اور اب بھی مانگتی رہتی ہوں کہ کاش وہ دن بھی آئے، جب طواف کے دوران ہم سب ان سیاروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر اپنے اپنے مدار پر چکر لگایا کریں۔ (آمین) طواف کے بعد سعی انجام دینے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ ہم نے دو فلور اوپر جا کر سعی کی اور اللہ کا بڑا کرم رہا کہ میں نے کسی سہارے کے بغیر زبیر کے ساتھ قدم ملا کر یہ فریضہ پورا کیا۔ حرم شریف سے باہر نکلے تو واپسی کے سفر کے لیے ٹیکسی کا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ وہی افراتفری کا عالم، ٹیکسیاں بہت تھیں، لوگ بھاگ بھاگ کر بیٹھ جاتے تھے کبھی کرایہ طے نہ ہونے پر اتار بھی دیے جاتے تھے۔ زبیر مجھے ایک جگہ کھڑا کر کے بھاگ دوڑ میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں میرے پاس آئے بولے 'سوری وہ ٹیکسی والا کافی آگے جا کر رکا ہے پیچھے نہیں آ سکتا، اب آپ کو چلنا پڑے گا'۔ میں ساتھ ہو لی اور پریشان بھی تھی کہ کہیں ٹیکسی والا چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ بولے آپ اطمینان رکھیں میں نے اسے دو لوگوں کے ساتھ مل کر ڈبل کرایہ پر راضی کیا ہے۔ ہم ٹیکسی تک پہنچے، ایک سعودی جوڑا پہلے سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور زبیر پیچھے بیٹھ گئے۔ مجھے بیچ میں گھسنا پڑا، مجبوری تھی۔ وہ جوڑا اپنے حصے کا کرایہ دے تھوڑے ہی فاصلے پر اتر گیا۔ زبیر آگے جا کر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور بنگلہ دیشی تھا وہ زبیر سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرنے لگا، وہ اس بات کا رونا رو رہا تھا کہ اس کاروبار میں بہت نقصان ہے بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو گئی اور پوچھ بیٹھی 'بیٹا یہ تم کس نقصان کی بات کر رہے ہو، بے بس حاجیوں سے منہ مانگے کرایے وصول کرتے ہو اور کہیں کہیں تو بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ لوگ جس میں بوڑھے بچے شامل ہیں تمہیں روکتے ہیں، باقاعدہ التجا کرتے ہیں اور تم ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہو، اتنا کما رہے ہو اور نقصان کا رونا روتے ہو'۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی کہہ گئی۔ زبیر مڑ مڑ کر دیکھتے رہے۔ پھر بول اٹھے 'پلیز اماں رہنے دیں'۔ لیکن ڈرائیور نے انہیں خاموش کر دیا۔ بولا 'آنٹی آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنی مجبوریاں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

میری طرح سینکڑوں بنگلہ دیشی، پاکستانی یہاں روزگار کے سلسلے میں آباد ہیں۔ تقریباً ہر ایک کی وہی کہانی ہے، پیسے کمانا اور اپنے خاندان کی کفالت کرنا۔ بنگلہ دیش میں میرے بوڑھے ماں

باپ ہیں، تین بہنیں ہیں جن کی شادیاں ہونی ہیں، میں جو کچھ بھی کماتا ہوں اس کا تین چوتھائی حصہ انہیں بھیج دیتا ہوں۔ایک کمرے میں تین اور لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں کرایہ کم پڑتا ہے لیکن سہولتیں ۔نہ پوچھیں بس گزارا ہو جاتا ہے۔آنٹی آپ نے ڈبل کرایے پر سوال اٹھایا۔تو سنیں ۔ہمارے روزی روٹی کمانے کے صرف دو سیزن ہیں۔ایک عمرہ اور دوسرا حج ،اس میں ہم جو بھی کمالیں بقیہ سال اسی پر گزارا کرنا ہوتا ہے۔ان دونوں سیزنوں کے علاوہ یہاں ٹیکسیاں کم ہی چلتی ہیں، جو غریب ہیں وہ ٹیکسی نہیں لیتے اور جو امیر ہیں ان کی اپنی گاڑیاں ہیں۔عمرے اور حج کے دنوں میں گاہک کو بھی دیکھ بھال کے بٹھانا پڑتا ہے۔ہم مقامی لوگوں کو کم ہی لے جاتے ہیں کیونکہ وہ پورا کرایہ بھی نہیں دیتے اور ہمیں باتیں بھی سناتے ہیں ۔رہی ڈبل کرایے کی بات تو ماشا اللہ جو حاجی اتنا پیسہ خرچ کر کے یہاں آتے ہیں، فور فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کرتے ہیں ان کے لیے سو دو سو ریال دینا کوئی بڑی بات نہیں۔اس کو صدقہء جاریہ ہی سمجھ کر دے دیں۔میں اس کی کہانی بڑے غور سے سنتی رہی یہ احوال یادداشت کے بل بوتے پر لکھا ہے۔

میں نے پوچھا 'جب ٹیکسی کھڑی کرنی پڑتی ہے تو کیا کرتے ہو'۔ایک سرد آہ بھر کر بولا 'نہ پوچھیں آنٹی ہمارے اقامے کے ساتھ کام کی بھی بڑی کڑی شرائط ہیں۔سرکاری طور پر نہیں لیکن ادھر ادھر ریسٹورینٹ یا کسی دکان میں چھوٹا موٹا کام مل جاتا ہے لیکن دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کیونکہ یہاں ذرا سی بات پر نہ صرف ملک بدر کر سکتے ہیں بلکہ جیل بھی ہو سکتی ہے۔' وہ تھوڑی دیر کے لے چپ ہو گیا ۔میں اور زبیر خاموش تھے اس کی کہانی کا دکھ جیسے سارے ماحول میں پھیل گیا تھا، ہماری منزل بھی آ گئی تھی میں نے زبیر کو اشارا کیا اس کو زیادہ پیسے دے دو۔وہ پہلے سے ہی تیار تھے۔میں نے ٹیکسی سے اتر کر اس نوجون کو بہت سی دعائیں دے کر رخصت کیا۔عزیزیہ پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔تھکن بے تحاشہ تھی اس لیے آرام کیا۔عشا کی نماز کے بعد میٹنگ ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کل ناشتے کے بعد ہم لوگ انشا اللہ مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوں گے ۔وہاں ہمارا قیام 19 ذی الحجہ تک ہوگا یعنی ہمیں پوری پانچ راتیں مکّے میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ہمارے پاس کمرے میں جو سامان تھا وہ ساتھ لے جانا تھا اور اسٹور میں رکھا ہوا سامان ہمیں مکہ پہنچ کر اپنے کمرے کے باہر رکھا ہوا مل جائے گا۔میرے پاس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا ایک چھوٹی ٹرالی اور رگ سیک میں کتابیں وغیرہ۔ حج کے حوالے سے ہمیں ہوٹل کی طرف سے کچھ کتابیں تحفتاً دی گئیں، وزن بہت زیادہ ہو رہا تھا اس لیے ایک دو رکھ لیں باقی وہیں چھوڑنی پڑیں۔

حرم شریف کو روانگی اور قیام

صبح ناشتے کے بعد ہم کوچ میں بٹھا دیے گئے، پھر وہی صبر آزما مرحلے، کچھ لوگ دیر سے آئے، گنتی بار بار کی گئی۔ پھر انتظار کہ کب سعودی اتھارٹی کوچوں کو روانہ ہونے کی اجازت دے گی۔ اللہ اللہ کر کے کوچیں روانہ ہوئیں۔ کوچ میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی کیفیت وہ نہیں تھی جو منیٰ اور عرفات کے سفر کے دوران تھی، اس وقت کے جوش و ولولہ کے بجائے ایک ذہنی آسودگی تھی۔ بس اب یہ حج کے دورانِ سفر کے آخری پانچ دن ہی تو رہ گئے تھے۔ اہم اور آخری فریضہ طواف الوداع تھا۔ اور پھر لندن کو واپس روانگی۔ زیادہ تر لوگ سوتے رہے میں اور زبیر بھی نیم غنودگی کے عالم میں تھے۔ راستہ لمبا نہیں تھا لیکن جگہ جگہ رکنا پڑا۔ ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے ظہر کا وقت نکل گیا۔ حج سے پہلے سیمینار میں ہمیں ان تمام مقامات کی تفصیل بتائی گئی تھی جہاں ہمارا قیام ہونا تھا۔ حرم شریف میں ایک عرصے سے تعمیراتی کام چل رہا ہے اور اس کے مطابق ہمارے ہوٹل کے نزدیک ترین گیٹ کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ ہوٹل حرم شریف سے اتنا قریب نہیں تھا کہ باہر نکلتے ہی مسجد کا دالان آ جائے۔ ہوٹل کے ریسیپشن ہال میں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ کئی گروپ ایک ساتھ چیک ان کے لیے آ گئے تھے۔ ہماری بکنگ تھی اس کے باوجود افراتفری کا منظر تھا۔ زبیر مجھے ایک جگہ بٹھا کر چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد آئے تو اس اطلاع کے ساتھ کہ ابھی ہمارے کمرے تیار نہیں ہیں، چابی رات تک ملے گی البتہ ہوٹل کے ریسٹو رینٹ میں جا کر حسبِ منشا کھا پی سکتے ہیں اور اپنا سامان ریسیپشن کے پاس چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہم نے اسے ہی غنیمت جانا۔ پہلے واش روم جا کر وضو کیا۔ ظہر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ ہوٹل میں نماز کا کمرہ تھا وہاں نماز پڑھی۔ پھر ریسٹورینٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ بہت رش تھا۔ کمروں کا مسئلہ بھی تھا اس لیے لوگ کہاں جاتے۔ بہر حال وہاں عصر تک بیٹھے رہے۔ پھر نماز پڑھنے کے لیے باہر آئے۔ حرم شریف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کافی لمبا راستہ تھا اور واپس آتے آتے رات ہو جاتی۔ اس لیے نماز پڑھ کر پھر ریسٹورینٹ کا رخ کیا۔ میں نے زبیر سے کہا 'کم از کم مغرب کی نماز کے لئے تو باہر نکلیں'۔ وہ راضی ہو گئے۔ زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے لہٰذا ہوٹل سے نکل کر آدھے راستے تک پہنچ کر اندازہ ہو گیا کہ اور آگے نہیں جا سکتے۔ حاجیوں کا ایک سیلاب مسجد کی طرف رواں دواں تھا، اذان بھی ہوا چاہتی تھی، زبیر نے وہیں سڑک کے کنارے میری

فولڈنگ کرسی بچھادی۔قطار در قطار صفیں بندھنی شروع ہوگئی تھیں۔الحمدللہ مسجد کے مینار نظر آرہے تھے ۔سب نے نماز پڑھی، پھر ہوٹل واپسی کا قصد کیا۔زبیر نے پھر ریسیپشن سے چابی کا پوچھا، انہوں نے بتایا کہ رات کے کھانے کے بعد چابی مل جائے گی۔ہم نے کھانا جلد ہی کھالیا، بھوک نہیں تھی لیکن تھکن بے تحاشہ تھی۔اللہ اللہ کر کے کمرے کی چابی ملی۔ہمارا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔کمرے کے باہر ہمارا بقیہ سامان بھی مل گیا۔ماشاللہ کمرہ بہت کشادہ تھا اور ایک دو نہیں تین ڈبل بیڈ سے آراستہ۔تھا۔کھڑکی کے ساتھ میز اور کرسیاں بھی سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔میں نے سب سے پہلے کھڑکی کے پاس جا کر دیکھا کہ وہاں سے کیا نظر آتا ہے، مسجد کے دو مینار اور دالان کا تھوڑا سا حصہ سامنے تھا، بیچ میں سڑک کا وہ حصہ بھی نظر آتا تھا جو مسجد کی طرف جاتا تھا۔اس وقت تک بھی نمازیوں کے پرے کے پرے حرم شریف کی طرف رواں دواں تھے۔غالباً یہ وہ لوگ تھے جن کا ارادہ تہجد کے بعد فجر تک مسجد میں قیام کا تھا۔تھکن کے باوجود میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اس قافلے میں شامل ہوجاؤں۔کیسی بے بسی تھی خانہ ءکعبہ کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی میں اس سعادت سے محروم تھی۔زبیر میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔کہنے لگے، اللہ کا بڑا کرم ہے ہمیں اس طرف کے کمرے ملے ہیں جہاں سے مسجد بھی دکھائی دے رہی ہے اور اذان تو پورے ہوٹل میں سنائی دیتی ہی ہے۔آپ نہا دھو کر تازہ دم ہوجائیں اور جتنی جلدی سو سکیں اچھا ہے تاکہ ہم انشاللہ بروقت فجر کے لیے مسجد جاسکیں'۔ان کی بات بھی صحیح تھی ۔صبح پہلے کوچ میں، پھر نیچے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے کمر تختہ ہو چکی تھی۔گرم گرم شاور سے بہت سکون ملا ۔میں نے اپنی دوائیں کھائیں اور دعا کی کتاب لے کر بستر میں گھس گئی۔زبیر لیپ ٹاپ پر یونیورسٹی کا کام کرنے لگے۔میں نے تھوڑی سی دعائیں پڑھی ہوں گی پھر یاد نہیں میں کیسے نیند کی گہری آغوش میں چلی گئی۔بعد میں زبیر نے بتایا کہ فجر سے پہلے میں نے آپ کو آوازیں دیں لیکن جواب نہیں ملا ۔حالانکہ میری نیند بہت ہلکی ہوتی ہے۔کوئی آواز یا کھٹکا ہو فوراً آنکھ کھل جاتی ہے۔جب میں نہیں اٹھی تو انہوں نے قریب آکر ہلایا اور آواز دی۔

مجھے کچھ کچھ یاد ہے میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں، حلق خشک ہو رہا اور دکھ بھی رہا تھا اور سارے بدن میں اینٹھن تھی۔زبیر نے بٹھا کر پانی پلایا۔ماتھا چھو کر بولے' آپ کو تو تیز بخار ہے ، ہمارے گروپ میں فلو پھیلا ہوا ہے شاید اسی کے آثار ہیں، اب تو آپ کو مکمل آرام کرنا ہوگا اور شاید اینٹی بائیوٹک بھی کھانی پڑے'۔میں تڑپ اٹھی 'یہ کیسے ہوسکتا ہے یہ عبادت کے دن ہیں، آخری چند روز جو مجھے ہوٹل میں نہیں حرم شریف میں گزارنے ہیں'۔مجھے یاد نہیں ہے زبیر شاید ڈاکٹر ساجد کو بلا کر

لائے تھے یا ان کو حال بتا کر ان سے اینٹی بائیوٹک لے لی تھی۔ بہر حال وہ پورا دن کمرے میں گذرا نماز کے وقت کرسی پر بیٹھ گئی۔ بخار کے ساتھ کھانسی بھی اٹھ رہی تھی۔ اس دن میں نے کیا کھایا پیا یا کچھ یاد نہیں۔ بہت دعائیں مانگیں 'اللہ میاں مجھے جلدی سے اس قابل کر دے کہ میں حرم شریف میں حاضری دے سکوں۔

طواف الوداع اور لندن واپسی

ہفتے کی رات تک میں اس قابل نہیں تھی کی طواف کے لیے جا سکوں بہر صورت ہمیں اتوار کی صبح تک یہ فریضہ انجام دینا تھا۔ ہماری واپسی کی فلائٹ بھی اسی دن تھی۔ گروپ لیڈر سے ہدایت ملی تھی کہ ہم اپنا سامان پیک کر کے فجر سے پہلے اپنے کمرے کے باہر رکھ دیں۔ صبح ساڑھے تین بجے کا الارم لگا کر لیٹے، نیند تو خیر کیا آنی تھی بس جھپکی لے لی۔ الارم بجنے سے پہلے ہی میں تو اٹھ بیٹھی۔ کوئی خاص سامان بھی پیک کرنا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ میرے پاس دو چھوٹی بڑی ٹرالیاں تھیں ،حالانکہ میں سوٹ کیس لا سکتی تھی لیکن میں نے احتیاطاً وہیل والی ٹرالیاں لی تھیں کہ اگر مجبوراً سامان گھسیٹنا پڑے تو کر سکوں۔ اب یہاں قیام کے دوران سامان تو نہیں بڑھا تھا بس چپلوں کے پانچ چھ جوڑے ہو گئے تھے۔ زبیر کے پاس بڑا سوٹ کیس تھا انہوں نے میری چپلیں اور دوسری چیزیں جن کی مجھے فوری ضرورت نہیں تھی اپنے سامان میں رکھ لیں۔ پانچ بجے سے پہلے ہمارا سامان کمرے کے باہر رکھ دیا گیا ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں میں نے رگ سیک میں ڈال لیں۔ سامان باہر رکھ کر زبیر فجر کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔ میں نے تہجد اور پھر فجر کمرے میں پڑھی۔ الحمد للہ طبیعت بہت بہتر تھی لیکن لگتا تھا جیسے ایک لمبی بیماری سے اٹھی ہوں، کھانا پینا برائے نام تھا اس لیے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اللہ سے بہت دعا کی کہ مجھے طواف الوداع کرنے کی ہمت اور طاقت دے۔ زبیر نماز پڑھ کر لوٹے۔ ہم نے نیچے ریسٹورینٹ میں جا کر ناشتہ کیا۔ میں نے بہ مشکل ایک کپ چائے اور ٹوسٹ زبردستی نگلا، صبح کی دوائیں کھائیں، پھر واپس اپنے کمرے میں گئے۔ وضو کیا۔ زبیر نے کہا' آپ کچھ نہ اٹھائیں'۔ انہوں نے اپنے رگ سیک میں پانی کی بوتلیں دعا کی کتاب رکھ لی اور میری فولڈنگ کرسی تھام لی۔

ہم دونوں حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ مسجد تک پہنچنے میں کوئی خاص رش نہیں ملا ۔زبیر بار بار کہہ رہے تھے' آپ ابھی کمزور ہیں اتنا نہیں چل پائیں گی، وہیل چیر پر بیٹھ کر طواف کر

لیں‘۔ادھر میرا دل اندر سے کہہ رہا تھا’ہمت کرو انشاللہ اپنے پاؤں پر چل کر یہ آخری طواف بھی کرلو گی‘۔ میں زبیر کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مسجد سے نکل کر خانہء کعبہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔اچانک چاروں طرف جیسے سر ہی سر نظر آنے لگے۔لوگوں کا جمِ غفیر خانہء کعبہ کے اطراف چکر لگا رہا تھا۔ مجھے لگا آج تو ضرورت سے زیادہ رش ہے۔آج بہت سی پروازیں حاجیوں کو واپس لے جا رہی تھیں اور زبیر کی طرح بہت سے لوگوں نے سوچ لیا تھا کہ طواف الوداع کر کے سیدھا ایر پورٹ جانا ہے، کیونکہ وداعی طواف کے بعد کوئی خرید وفروخت نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ میں نے اللہ تعالی سے دعا مانگی کہ مجھے ہمت،حوصلہ اور صبر عطا کر اور میرے بیٹے زبیر کو دگنی ہمت اور صبر دے کیونکہ وہ میری ذمہ داری بھی نبھا رہے تھے۔ہم دونوں بسم اللہ پڑھتے ہوئے آخری گھیرے میں شامل ہو گئے ۔صورت حال بالکل ویسی ہی تھی جیسی پچھلے طواف میں بلکہ اس سے بھی زیادہ گھمبیر۔جیسے ہی گرین لائٹ نظر آنے لگتی ،طواف کرنے والوں میں اور زیادہ تیزی آنے لگتی اور خانہ کعبہ کے قریب تر ہونے کی کوشش میں باہر کے گھیرے سمٹ کر اتنے قریب آجاتے کہ سانس گھٹنے لگتی اور دھکے لگنے تو لازمی تھے، خاص طور پر مجھ جیسوں کے لیے جو بچ بچا کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔زبیر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔دوسرے ہاتھ میں میری فولڈنگ کرسی اور کاندھے پر رگ سیک۔ بیچارے بچّے کو خود اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا،اوپر سے میری فکر کہ اماں کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔جیسا کہ میں نے پہلے طواف کی کیفیت بیان کی ہے،حجر اسود تک پہنچتے پہنچتے ایسا لگتا تھا لوگ ایک دوسرے پر اوندھ رہے ہیں۔

اس مقام کے بعد بھیڑ چھٹ جاتی اور سکون سے طواف اور دعائیں جاری رہتیں۔اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے سات چکّر پورے ہوئے اور زبیر مجھے گھیرے سے آہستہ آہستہ باہر کی طرف لے کر نکلتے چلے گئے۔ہم باہر نکلے تو زبیر نے ایک مناسب جگہ پر میری کرسی رکھی، پھر میرے لیے زم زم لائے دونوں نے سیر ہو کر پیا۔مقامِ ابراہیم کے آس پاس جگہ ڈھونڈ کر مجھے بٹھایا خود میرے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔دونوں نے نماز ادا کی، دعائیں مانگیں،یقین نہیں آرہا تھا کہ ہمارے حج کا سفر اب ختم ہونے کو ہے۔یہ ڈھائی ہفتے کیسے اور کتنی جلدی گزر گئے۔ مجھے اس قیام کا ایک ایک لمحہ اتنا قیمتی اور یادگار لگا کہ گھر واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہمارے سامنے خانہء کعبہ تھا اور اس کے اطراف ٹھاٹھیں مارتا ہوا لوگوں کا سمندر۔یہ مقدس سرزمین ہمیشہ نمازیوں اور حاجیوں سے بھری رہتی ہے ۔گو حج اور عمرے کے بعد رش کم ہو جاتا ہے لیکن مسجد میں نمازیوں کی کمی نہیں ہوتی اور طواف تو دن

رات جاری رہتا ہے۔ میں نے اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ پر آخری نظر ڈالی، ہم اللہ کے مہمان تھے۔ اس ربِ کریم نے ہر طرح سے ہماری حفاظت کی۔ زبیر نے ہولے سے میرا کندھا ہلایا اور بولے 'اماں چلیں ساڑھے گیارہ بجے کوچ روانہ ہو جائے گی'۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی یلغار نے سارے منظر دھندلا دیے تھے۔

'چلو بیٹا' میں نے آنسو پونچھ کر خانہء کعبہ کو الوداعی نظروں سے دیکھا، اور ان کا ہاتھ پکڑ کر واپسی کے لیے چلنا شروع کر دیا۔ ہوٹل واپس پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ تھوڑا آرام کیا۔ زبیر نے کہا میں چائے بنا دیتا ہوں آپ کچھ کھا لیں، ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔ میں نے چائے کے ساتھ بسکٹ اور ایک کیلا کھا لیا۔ زبیر نے میرے رگ سیک میں کھانے پینے کی کئی چیزیں ڈال دیں۔ اب یہاں سے ہمارا سفر مختلف سمتوں کی طرف تھا۔ زبیر کی سعودی ایر لائن ایک بجے جا رہی تھی اور ہمارے گروپ کی ٹرکش ایر لائن پونے دو بجے، پہلے استنبول اور پھر لندن۔ زبیر نے کوشش کی کہ وہ میرے ساتھ کوچ میں ایر پورٹ تک جا سکیں تا کہ سامان اتارنے میں میری مدد کر سکیں لیکن پھر وہی سیکیورٹی کا مسئلہ۔ اتفاقاً میری کوچ میں ناہید اور پروین کی فیملی نہیں تھی۔ انہوں نے دلاسا دیا تھا کہ وہ مجھے ایر پورٹ پر مل جائیں گی۔ بہر حال زبیر نے مناسب سمجھا کہ وہ ٹیکسی کر لیں اور ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوں۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ زبیر ہمارے ٹرمینل کے اندر نہیں جا سکتے۔ جو کچھ بھی تھا کم از کم ایر پورٹ پر ملنا تو ہو جاتا۔

الوداع اے مقدس سرزمیں

ہمارے گروپ کی کوچیں آہستہ آہستہ روانہ ہوئیں میں نے کھڑکی سے جھانکا، سورج کی تیز روشنی میں مکہ معظّمہ جگمگا رہا تھا، خانہء کعبہ نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ ہم اس سے دور ہوتے جا رہے تھے، الوداع اے مقدس سرزمین، رخصت چاہتی ہوں میرے پاک پروردگار تو نے مجھے حج بیت اللہ کی سعادت بخشی، کیسی کیسی کرامات سے نوازا، قدم قدم پر آسانیاں پیدا کیں، ہمت و حوصلہ دیا، ورنہ تیری یہ گنہ گار بندی اس لائق کہاں تھی کہ یہاں تک پہنچ سکے۔ یہ خیالات ابھی تک میرے ذہن میں آ رہے ہیں جب میں یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ مکّہ سے واپسی پر کیا احساسات تھے مجھے تفصیل یاد نہیں۔ سامان اور آگے سفر کیسا ہوگا کی فکروں نے مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہوگا۔ ایر پورٹ تک کا سفر مجھے بالکل یاد نہیں لیکن اس خوشی کا احساس شدّت

سے تھا کہ الحمدللہ ہم حج کا فریضہ ادا کر کے خیریت کے ساتھ اپنے گھر واپس لوٹ رہے تھے۔

ہماری کوچ ایر پورٹ کے ٹرمینل میں داخل ہو کر کوچوں کے پارکنگ ایریا میں رک گئی۔ ہم کوچ سے اترے تو افراتفری کا منظر سامنے تھا۔ ہمارا الگ سے بھیجا گیا سامان کچھ فاصلے پر ڈھیر کی صورت میں بکھرا اور اوندھا پڑا تھا۔ جو لوگ پہلے پہنچ گئے تھے وہ اپنا سامان ڈھونڈنے کے چکر میں دوسروں کے سوٹ کیسوں کو اِدھر اُدھر پھینک رہے تھے، یہاں روشنی بھی بہت کم تھی اور موبائل کی ٹارچ سے سب اپنا اپنا سامان تلاش کر رہے تھے۔ میں بے بس کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں؟ ،سوچا کیوں نہ ایک پورٹر کرلوں، ادھر ادھر دیکھا ایک پورٹر خود ہی میرے پاس آ گیا، ابھی میں اس سے ٹرالی لانے کی بات کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں زبیر نے پیچھے سے آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔' آپ یہاں ہیں اور میں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرا'۔ میں انہیں دیکھ کر کھل اٹھی 'ماشاللہ تم یہاں کیسے آ گئے تمہارا تو دوسرا ٹرمینل ہے'۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے' آپ کو رخصت کئے بغیر میں کیسے جا سکتا ہوں'۔ پہلے انہوں نے پورٹر سے معذرت کر لی، پھر میری کوئی بات سنے بغیر وہ سامان کی طرف لپکے۔ سوٹ کیسوں اور ٹرالیوں کی بھرمار تھی، اچھا خاصا اندھیرا تھا، موبائل کی روشنی میں زبیر نے گھوم گھام کر میرا سامان تلاش کر ہی لیا اور پھر کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک سامان رکھنے والی ٹرالی بھی لے آئے۔ میں نے پوچھا' اور تمہارا سامان کہاں ہے؟' دور کھڑی ایک ٹرالی کی طرف اشارا کیا' وہ رہا'۔ میں گھبرا گئی 'اپنا سامان اس طرح تو نہ چھوڑو' وہ بولے وہ بھی لے آتا ہوں' میں پریشان ہوگئی 'بیٹا تم دو ٹرالیاں کس طرح گھسیٹو گے اور تم تو ٹرمینل کے اندر بھی نہیں جا سکتے۔' کہنے لگے 'انشااللہ سب ہو جائے گا آپ یہاں بھیڑ سے ہٹ کر روشنی میں کھڑی ہو جائیں' انہوں نے سامان کی دونوں ٹرالیاں میرے پاس کھڑی کر دیں۔ اب وہ میرا پاسپورٹ لے کر زم زم کی وصولیابی کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں اپنے بچّے کے لیے پریشان تھی کہ یہ سب کیسے سنبھالے گا، اس چکر میں کہیں اس کی فلائٹ نہ نکل جائے۔ اس دوران ناہید اور پروین بھی نظر آ گئیں، دونوں کہنے لگیں۔

'ہم تو کوچ سے اترتے ہی آپ کو ڈھونڈتے رہے ہیں شکر ہے آپ مل گئیں'۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بولیں منٹو، شیشو اور روحی بھی زم زم کے لیے قطار میں کھڑے ہیں۔ تھوڑے انتظار کے بعد زم زم کی بوتلیں بھی مل گئیں اور ٹرالی میں رکھ دی گئیں۔ اب ہم ٹرمینل کی جانب روانہ ہوئے۔ میں نے ناہید کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ پروین بار بار زبیر سے کہہ رہی تھیں۔

'آپ فکر نہ کریں اب ہم آنٹی کے ساتھ ہی رہیں گے'۔ زبیر شکریہ ادا کرتے ہوئے دونوں

ٹرالیاں گھسیٹ رہے تھے ۔شیشو نے اپنے بیٹے روحی سے کہا۔'انکل سے ایک ٹرالی لے لو'۔زبیر کو نہ جانے کیا سوجھی کہنے لگے ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اپنی ٹرالی لے کر غائب ہو گئے۔تھوڑی دیر میں دیکھا خالی ہاتھ چلے آرہے تھے'ہائیں! ٹرالی کہاں چھوڑ آئے'۔ہنس کر بولے'پارکنگ لاٹ میں پارک کر کے آ گیا'۔سب ہنسنے لگے۔لیکن مجھے تشویش ہوئی۔'بیٹا کوئی سامان اٹھا کر نہ لے جائے'ان کا اطمینان قائم تھا' کیا لے جائے گا اس میں میرے اور آپ کے پرانے کپڑے اور چپلیں ہی تو ہیں'۔ہم ٹرمینل میں داخل ہوئے، کسی نے وک ٹوک نہیں کی۔ چیک ان کے کاؤنٹروں پر قیامت کا رش تھا، میں ناہید کے ساتھ کھڑی ہو گئی، مرد سامان لے کر ٹرالیوں کو آگے بڑھاتے رہے، ہماری باری آئی تو میرا پاسپورٹ بھی سب کے ساتھ پکڑا دیا گیا۔

اس طرح چیک ان ایک ساتھ ہوا اور نشستیں بھی ساتھ ساتھ مل گئیں۔زبیر نے کہا آپ کے لیے ونڈو سیٹ بہتر ہے، بیچ میں بیٹھنے سے آپ کے بازو کی تکلیف بڑھ جائے گی۔شیشو بولے' آپ فکر نہ کریں ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے اور اب آنٹی ہماری ذمہ داری ہیں۔زبیر جذباتی ہو کر ان کے گلے لگ گئے۔میری آنکھوں میں تو آنسو جیسے امنڈنے کے لیے بے قرار تھے، بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔سامان کی چیک ان کے مرحلے سے گزرے تو زم زم کی چیک ان کے لئے پھر قطار میں لگنا پڑا۔زم زم کی بوتلیں کارڈ بورڈ کے ڈبوں میں پیک کی ہوئی تھیں اور ہر ڈبے پر نام، پتہ اور فلائٹ نمبر لکھنا ضروری تھا۔ یہاں بھی الحمدللہ چیک ان خیریت سے ہو گیا لیکن پروین کی فیملی ابھی تک قطار میں کھڑی تھی۔ان کے آگے ایک بہت بڑا خاندان تھا، جس کی وجہ سے زم زم کے بھی کئی ڈبے تھے۔اللہ اللہ کر کے ان کی بھی باری آئی۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا، اب ہمیں اندر جانا تھا، میرے لیے یہ صبر آزما لمحات تھے۔ بیٹے کے ساتھ حج کا سفر یہیں تمام ہو رہا تھا۔کس محبت اور لگن سے زبیر نے میرے اس سفر کو آرام دہ اور یادگار بنایا تھا؟ اپنے آرام کی پرواہ نہیں کی، میرا ہر طرح خیال رکھا۔ ہمارے گروپ کے بہت سے لوگ بھی زبیر کے نرم برتاؤ اور بروقت مدد کا بڑے پیار سے ذکر کرتے رہے۔ میں نے زبیر کو خدا حافظ کہا گلے لگایا، پیار کیا، میرا بچّہ زندہ سلامت رہے۔کس صبر و تحمّل سے اس نے اس پورے سفر میں میرا ساتھ دیا۔دل سے ڈھیروں دعائیں نکل رہی تھیں اور میں زار و قطار رو رہی تھی، سب ہی آبدیدہ تھے، ناہید اور پروین نے دونوں طرف سے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔زبیر نے حسب عادت اس جذباتی منظر سے نکلنے کی کوشش کی'اماں میں دو ہفتے بعد تو لندن آ رہا ہوں، میری حج کی دعوت یاد رکھیے گا، آپ کے ہاتھ کا پلاؤ اور شامی کباب کھانے ہیں' شیشو بولے پھر تو ہمیں بھی آنا

پڑے گا، میں نے کہا 'ضرور اب تو ہمارا ملنا ملانا رہے گا'۔ زبیر سے رخصت ہو کر ہم اندر آ گئے۔ ان کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ رویا رویا سا لیکن میرے سامنے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ 'اللہ میاں میرے بچّے کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور خیریت سے اپنے گھر پہنچائے'۔ اندر جا کر وہی پاسپورٹ کی جانچ پڑتال اور دستی سامان کی اسکریننگ۔ ماشا اللہ ہر مقام پر شیشو، منٹو اور روحی آگے آگے رہے اور میں ان کے ساتھ نکلتی چلی گئی۔

ان سب مرحلوں سے فارغ ہو کر ایک جگہ بیٹھے تو بھوک نے ستایا۔ ہم سب برائے نام ناشتہ کر کے چلے تھے۔ ہمارے کے پاس جو اسنیکس تھے وہ نکالے۔ شیشو چائے لے آئے گرم گرم چائے اچھی لگی، کھانے پینے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے لیکن ابھی تک ہماری فلائٹ کا گیٹ نمبر نہیں آیا تھا، اچانک ہی اعلان ہوا ٹرکش ایر لائن کے مسافر گیٹ نمبر 42 پر آ جائیں جو اتفاق سے ہمارے سامنے ہی تھا، اعلان سنتے ہی مسافروں نے قطار بنانی شروع کر دی۔ شیشو بولے ابھی سے کھڑے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں، بیکار ٹانگوں میں درد ہوگا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی قطار میں شامل ہونا پڑا، جہاز کے اندر پہنچے۔ خوش قسمتی سے ہم سب کو آگے پیچھے ساتھ ساتھ نشستیں مل گئیں ہم صبح سویرے کے اٹھے ہوئے تھے، مڑ کر دیکھا تو تینوں مرد حضرات سو رہے تھے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں جہاز کا مستعد عملہ مسافروں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آیا اور سب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ یہ پرواز صرف تین گھنٹے کی تھی۔ جب تک کھانے پینے سے فارغ ہوئے لینڈنگ کا اعلان ہونے لگا۔

استنبول کے ٹرانزٹ لاؤنج میں پہنچے، ادھر ادھر دیکھا، کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ فجر کا وقت ہو چلا تھا اور ایر پورٹ کا یہ حصہ نسبتاً خالی تھا۔ سوچا وضو کر کے وہیں نماز پڑھ لی جائے۔ کعبہ کس طرف ہے کس سے پوچھیں۔ ایک سوڈانی مسافر نے اپنا کمپس دیکھ کر بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف رخ بتایا۔ مجھے بیٹھنے کو کرسی مل گئی وہیں بیٹھ کر نیت باندھ لی، مرد ذرا فاصلے پر نماز پڑھنے لگے سب نے اپنے کوٹ یا چادریں بچھالی تھیں کیونکہ ننگے فرش پر پڑھنا مشکل تھا۔ اس دوران دو اور پروازیں آ گئیں اور لاؤنج کھچا کھچ مسافروں سے بھر گیا۔ سب ہی نماز پڑھنا چاہ رہے تھے۔ اب جو دیکھا تو یہ لوگ بالکل دوسری سمت منہ کئے سجدے کر رہے تھے۔ منٹو اور شیشو نے انہیں صحیح رخ سے آگاہ کرنا چاہا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ناہید بولیں۔ اللہ عبادت قبول کرنے والا ہے۔ اس میں مسافروں کا کیا قصور ہے؟۔ کم از کم نماز کے لیے تو کوئی ہدایات یا اشارہ ہوتا۔ بہر حال اب آگے جانے والی

فلائٹ کی فکر ہوگئی۔ بہت دور پاسپورٹ کنٹرول کا بورڈ نظر آیا جو شاید ابھی لگایا گیا تھا۔ ہم اس طرف روانہ ہوئے۔ دیکھا تو لوگ نہ جانے کب سے قطار در قطار کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم صحیح جگہ پر ہیں یا نہیں، آگے سے ہمارے گروپ کا ایک رکن خبر لایا کہ ہم غلط قطار میں ہیں، ہمیں دوسری طرف جانا چاہیے۔ ہم دوسری جانب لپکے یہاں بھی ایک لمبی چوڑی قطار ہماری منتظر تھی۔ اس آنکھ مچولی میں جہاز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، روحی نے کہا گیٹ نمبر بھی آ گیا ہے، اللہ اللہ کر کے پاسپورٹ کنٹرول سے نکلے، بھیڑ اتنی تھی کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم ایر پورٹ کے کس حصے میں کھڑے ہیں، باہر نکل کر دیکھا تو ہمارا گیٹ نمبر 712 تھا جبکہ ہم گیٹ نمبر 200 کے پاس تھے، ناہید نے کہا اب تو دوڑ لگانی ہوگی، ادھر میں بھاگ دوڑ سے پہلے ہی ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھک چکی تھی۔ قطار میں کھڑے کھڑے رہنا بھی مجھے نڈھال کر گیا تھا۔ اب جو اتنی دور گیٹ ہونے کا مژدہ سنا تو جان ہی نکل گئی، مردوں کو آگے روانہ کر دیا گیا، ناہید ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، میں پروین کا ہاتھ تھامے نسبتاً آہستہ چل رہی تھی، ناہید مستقل ہمت بندھا رہی تھیں، 'شاباش آنٹی آپ اس سے بھی تیز چل سکتی ہیں، چلتی رہیے'، میں پسینے میں شرابور اور نڈھال ان کی ہمت افزائی کے جواب میں قدم تیزی سے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ راستے میں دو برقی زینے آئے لیکن دونوں بند تھے، سبھی لوگ بھاگ رہے تھے، فلائٹ جانے میں شاید دس منٹ رہ گئے تھے، اپنی پوری زندگی میں میں نے کبھی اتنا دباؤ محسوس نہیں کیا تھا اور نہ کبھی اتنا تیز چلی تھی، ایسا لگتا تھا کہ ابھی تھک کر گر پڑوں گی۔

ہم اب بھی اپنے گیٹ سے بہت دور تھے۔ اب میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ میں ایک جگہ رک گئی۔ اور ان دونوں سے کہا 'تم لوگ آگے جاؤ، میری پرواز مس ہو جائے تو کوئی بات نہیں تم جاؤ تمہاری فیملی بھی آگے جا چکی ہے' دونوں ایک ساتھ بولیں 'ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے'۔ اب دونوں نے دائیں بائیں مجھے سہارا دے رکھا تھا، میں کسی نادیدہ قوت کے بل پر ان کے ساتھ چلتی رہی، جہاز کے اندر کیسے پہنچی مجھے کچھ یاد نہیں، نشست پر بیٹھ کر جب ناہید نے پانی کا گلاس پکڑایا تو جیسے بُرے خواب سے بیدار ہوئی۔ ناہید اور پروین کا کہنا تھا' آج تو آنٹی نے ہمت اور حوصلے کی جو مثال قائم کی ہے اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے' اور میں سوچ رہی تھی کہ ایسی پرخلوص دوستوں کا ملنا مقدر کی بات ہے۔ جہاز محوِ پرواز تھا اور مسافر خوش اور پرسکون نظر آ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ ہمارے سفر کا اختتام نہیں تھا بلکہ ہمیں جو سعادت نصیب ہوئی تھی اس کی روشنی میں ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔

بابِ آخر

انسان سوچتا کچھ اور ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو۔ میرا حج کا سفر اگست 2017 میں مکمل ہوا۔ میری نیّت اور دلی خواہش تھی کہ یہ سفر نامہ جلد سے جلد شائع ہو جائے، لیکن طبیعت کی خرابی کا کچھ ایسا سلسلہ چلا جو طول پکڑ گیا اور طبیعت سنبھلتے سنبھلتے یہ سال بھی نکل گیا۔ 2018 میں عثمان صاحب کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی، دو منی اسٹروک ہوئے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتے چلے گئے۔ اسی سال جولائی میں ہماری شادی کے پچاس سال مکمل ہوئے۔ اس کے تین مہینے بعد 11 اکتوبر کو وہ ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ اتنی طویل رفاقت کے بعد ہم سفر بچھڑ جائے تو اس کیفیت کو الفاظ کے دائرے میں لانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مجھے مہینوں لگ گئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کہ اب عثمان صاحب واپس نہیں آئیں گے۔ پورا سال اسی بے یقینی کی فضا میں گزر گیا۔ لکھنا پڑھنا تو درکنار کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عثمان صاحب نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جہاں مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں، وہیں میرا ہاتھ پکڑ کر یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ میں اپنا حج کا سفر نامہ ضرور مکمل کروں گی۔ ان کی اسی خواہش کے احترام میں پچھلے سال کے آخر میں، میں نے پھر سے قلم سنبھال لیا جس کا نتیجہ آپ کے پیش نظر ہے۔

☆☆☆

Main Khatakaar tu bakhshanhaar,dil dariya bahta jaye,be libaas aayine

(Main Zinda Aadmi hoon) by Khalid Hussain (RTD. D.C) Jammu

خالد حسین (جموں) cell-7006898585, 9419183485

میں خطاوار تُو بخشنہار

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے (اقبالؔ)

14 نومبر 2005ء کو خالد حسین کے چھوٹے بیٹے یاسر عمران کی شادی فاروق بیگ کی بڑی بیٹی ثنا فاروق کے ساتھ بٹھنڈی کالونی کے نئے گھر میں ہوئی۔ شادی سے پہلے اُنہوں نے حج پر جانے کا ارادہ باندھا تھا اور اِس سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر جموں کے دفتر میں اپنے اور اہلیہ نسیم فردوس کے کاغذات جمع کرادیئے تھے۔ ستمبر 2005ء میں فریضۂ حج پر جانے والی فہرست میں اُن کا نام بھی درج تھا۔ جانے سے قبل حاجیوں کو حج سے متعلق ضروری ہدایات اور ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ مکّہ اور مدینہ میں اُنہیں کوئی دشواری نہ آئے۔ یاسر کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ منگنی کی رسم ادا کی جا چکی تھی اور شادی کے لئے دلہن کے والدین دسمبر 2005 یا جنوری 2006 کی تاریخیں دے رہے تھے۔ اسی دوران حج پر جانے کی حتمی تاریخ کا اعلان سرکاری طور پر کر دیا گیا۔ خالد حسین اپنی اہلیہ نسیم فردوس کے ساتھ اگر حج پر چلے جاتے تو پیچھے گھر کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑا بیٹا الگ رہتا تھا اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ خالد حسین اپنے سمبندھی فاروق بیگ اور اُس کے بڑے بھائی یاسین بیگ سے ملا اور ساری صورتِ حال بیان کی تو یہ فیصلہ ہوا کہ حج پر جانے سے قبل یاسر اور ثنا کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ نومبر میں شادی ہوئی اور 6 دسمبر 2005 یعنی شادی کے بائیس دِن بعد خالد حسین اور نسیم فردوس حج کے لئے سعودی عرب روانہ ہو گئے۔ خالد حسین کے بچپن کے دوست تاج محی الدین اُن کی اہلیہ امینہ تاج اور بیٹی ڈاکٹر عرشی تاج بھی اس سفر مقدس میں ہمارے ہم سفر تھے۔ حاجیوں کو سری نگر انٹرنیشنل ائرپورٹ سے ائرانڈیا جہاز میں سوار ہو کر سیدھا جدّہ ہوائی اڈے پر اُترنا تھا۔ روانگی سے قبل سری نگر کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر ہی خالد حسین اور اُن کے دوست تاج صاحب نے احرام باندھ لیا تھا (مکہ پہنچنے سے پہلے ہر مرد حاجی کو اپنے کپڑے اُتار کر، بغیر سلی دو سفید چادریں اپنے

جسم پر لپیٹنی ہوتی ہیں۔ایک کمر سے اوپر اور دوسری کمر سے نچلے حصے پر۔اِس عمل کو احرام کہتے ہیں۔ اور مکہ کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے یہ عمل مکمل کرنا ضروری ہے) عورتوں کے لئے احرام باندھنا ضروری نہیں۔اُن کے پہنے ہوئے کپڑوں کو ہی احرام مان لیا جاتا ہے۔تاج محی الدین صاحب خصوصی طیارے کے ذریعے الگ سے جدہ پہنچے اور وہاں اُنھیں مکہ شریف کے ایک پانچتارہ ہوٹل میں لے جایا گیا کیونکہ وہ ایک نجی ٹریول ایجنسی ''الخُدام'' کے ذریعے گئے تھے۔جبکہ ہم مرکزی سرکار کی طرف سے منظور شدہ ائرانڈیا کی فلائٹ کے ذریعہ روانہ ہوئے تھے۔ہمارا جہاز تیل بھرنے کے لئے کچھ دیر شارجہ میں رُکا پھر اُس نے جدّہ کے لئے اُڑان بھری۔جدّہ میں ہمارے لئے بسوں کا انتظام کیا گیا تھا ہمارا سامان جدّہ ائرپورٹ کے ملازموں نے بسوں پر رکھا اور بسیں مکّہ شریف کے لئے روانہ ہوگئیں۔راستے میں بسوں کو روک روک کر مقامی لوگ آبِ زم زم، جوس، کھجوریں اور پھل پیش کررہے تھے۔رات کے پچھلے پہر یعنی تین بجے (سعودی وقت کے مطابق) ہم مکّہ معظّمہ پہنچے۔ جس بس میں خالد حسین اور میں سوار تھے، اُسے ڈرائیور نے خُدام کے دفتر کے سامنے جا کھڑا کیا۔خُدام نے عربی زبان میں مختصر سی تقریر کی جس کا ترجمہ اُس کے ہندوستانی ملازم نے کیا۔کیرالہ کے رہنے والے اُس ملازم نے پھر ہمارے جتھے کو خانہ کعبہ لایا تاکہ ہم عمرہ کرسکیں۔جو بھی حاجی مکّی میں داخل ہوتا ہے اُسے سب سے پہلے عمرہ کرنا پڑتا ہے۔عمرہ کرنے کے لئے خانہ کعبہ کا طواف کرنا لازم ہے۔یعنی خانہ کعبہ کے سات چکر لگانے اور ہر چکر کے بعد خانہ کعبہ کی دیوار میں لگے سنگ اسود (کالا پتھر) کو چُومنا پڑتا ہے لیکن اگر بھیڑ بہت زیادہ ہو تو چکر ختم ہونے پر اشارے سے سنگِ اسود کو چُوم لیا جاتا ہے۔سات چکر پورے ہونے کے بعد مقام ابراہیم کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے باہر نکل کر سعی کرنی پڑتی ہے (خانہ کعبہ کے ساتھ ''صفا'' اور ''مروہ'' کی پہاڑیوں کے بیچ بنے راستے پر سات چکر لگانے کو ''سعی'' کہتے ہیں) اور پھر نائی سے سر کے بال منڈوانے پڑتے ہیں۔کچھ لوگ تو پورے بال اُتار دیتے ہیں جبکہ کچھ شرط پوری کرنے کے لئے تھوڑے سے بال کٹوا لیتے ہیں۔عورتوں کو بھی بالوں کی لِٹ سے تھوڑے سے بال کاٹنے پڑتے ہیں۔یوں عمرہ کرنے کا عمل پورا ہوجاتا ہے اور پھر حاجیوں کو الاٹ کئے گئے ہوٹلوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔حاجی لوگ احرام اُتار کر عام کپڑے پہن لیتے ہیں۔یہ عمل بہت تھکا دینے والا ہوتا ہے۔عام طور پر حاجی فجر کی نماز پڑھ کر اور نہاری یا ناشتہ کھا کر سو جاتے ہیں۔

میرا نام پرویز خطیب ہے۔ میں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کے لئے مکہ شریف

گیا تھا اور سرینگر سے مکہ تک خالد حسین کا ہمسفر تھا۔ خُدام نے مجھے اور خالد حسین کو ایک ہی کمرے میں رکھا تھا اور ہم دونوں اپنی اپنی اہلیہ کے ساتھ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں اور قرآن مجید کے سپارے پڑھنے حرم شریف جاتے۔ ہر روز دو تین بار خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے۔ ایک دِن صبح ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب غارِ حرا (وہ غار جہاں محمدؐ نے عبادت کی اور جہاں اُن پر وحی (غیبی آواز) اُتری تھی اور نبوت کی بشارت ملی تھی) کی زیارت کرنے گئے۔ دوسرے روز ہم نے مسجد عائشہ اور 'خندق' کا میدان دیکھا جہاں ہمارے رسولؐ نے منافقوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ کچھ دِنوں کے اندر اندر ہم نے مکّہ شریف کے قرب وجوار میں سبھی تاریخی مقامات کی زیارت کر لی۔ پھر ہمیں خُدام مدینہ منورہ لے کر گئے جہاں حاجیوں کو چالیس نمازیں ادا کرنی ہوتی ہیں یعنی آٹھ دِن مدینہ میں قیام کرنا ہوتا ہے۔ وہاں بھی ہمارے رہنے کا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ یہ نمازیں مسجد نبوی میں پڑھنی پڑتی ہیں جہاں حضرت محمدؐ دفن ہیں۔ ان کے روضۂ مبارک پر تقریباً روز ہم حاضری دیتے تھے اور دعائے خیر مانگتے تھے۔ نویں دِن ہم پھر واپس مکہ کے لئے روانہ ہوئے اور اپنے ہوٹل میں جانے سے پہلے پھر عمرہ کرنے کے لئے احرام باندھ کر خانہ کعبہ گئے۔ طواف کے بعد سعی کی۔ بال منڈوائے۔ پھر اپنے ہوٹل میں آئے۔ پنجگانہ نمازیں حاجی صاحبان حرم میں ہی پڑھنا ثواب سمجھتے ہیں۔ اور خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے رہتے ہیں۔ خالد حسین کے دوست تاج محی الدین خانہ کعبہ کے بالکل سامنے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ خالد حسین اور ان کی اہلیہ روز فجر کی نماز کے بعد اُن کے ہوٹل میں جاتے اور ناشتہ اُن کے ساتھ کرتے۔ جُوں جُوں ایام حج نزدیک آتے گئے تو حاجیوں کی بھیڑ بھی بڑھنے لگی۔ پکوانوں کی دُکانوں، ہوٹلوں اور نائیوں کی دُکانوں کے نرخ دوگنے بلکہ تین گنا بڑھ گئے۔ جہاں پہلے سر کے بال اُتارنے کیلئے نائی ایک یا دو ریال لیتے تھے، اب تیس ریال مانگنے لگے۔ جو نان ایک ریال میں ملتا تھا، اب دس ریال میں ملنے لگا۔ غرض بازاروں میں بکنے والی اشیاء مہنگی ہونا شروع ہو گئیں۔ پھر حج کی رسمیں شروع ہوئیں اسلامی مہینے (ہجری سن) ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ کو سبھی حاجی مِنیٰ جاتے ہیں جہاں حاجیوں کے ٹھہرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔ نہانے اور صفائی دُھلائی کا انتظام قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ دوسرا دِن (۹/ذی الحجہ) حاجی عرفات کے میدان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے ہیں اور شام کو سورج ڈھلنے کے بعد مزدلفہ آجاتے ہیں اور ساری رات ربّ العزت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ نفل ادا کرتے ہیں اور ۱۰/ ذی الحجہ کی صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد واپس منیٰ اپنے اپنے خیموں میں آجاتے ہیں۔ چائے اور ناشتہ

کے لئے ہر ملک کے طعام خانے ہوتے ہیں۔ بھارتی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی دُکانوں پر بہت زیادہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ناشتہ کھانے کے بعد حاجی اپنے خیموں میں جا کر سو جاتے ہیں جبکہ کچھ ناشتہ کرنے کے بعد ہی رمی (شیطانوں کو کنکریاں مارنا) کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے لئے علامت کے طور پر تین دیواریں بنائی گئیں ہیں یعنی بڑے شیطان کی علامت کے لئے بڑی دیوار، اس سے چھوٹے شیطان کے لئے چھوٹی علامتی دیوار اور تیسرے شیطان کے لئے اُس سے بھی چھوٹی دیوار۔ لوگ ان تینوں دیواروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ اس عمل کو رمی کہتے ہیں۔ خالد حسین اور اُس کی بیوی نسیم فردوس ناشتہ کرنے کے بعد رمی کرنے چلے گئے جب کہ ہم آرام کرنے کے لئے اپنے خیمے میں آ گئے۔ ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد رمّی کرنے کے لئے منیٰ سے نکلے جبکہ تب تک خالد حسین اور اُن کی اہلیہ یہ عمل مکمل کرنے کے بعد مکہ شریف اپنے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ رمی کرنے کے لئے لاکھوں کی بھیڑ کیڑے مکوڑوں کی رفتار سے چلتے ہوئے اس عمل کو پورا کرتی ہے۔ اکثر اس بھیڑ میں دھکم پیل کی وجہ سے بھگدڑ میں سینکڑوں حاجی مر جاتے ہیں۔ ایسا ہی حادثہ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ جب بھگدڑ میں 450 حاجی مر گئے اور ہم لاشوں پر سے گذر کر اپنے ہوٹل پہنچے۔ خالد حسین اور ان کی اہلیہ اس حادثے سے بے خبر اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے جب اُن کے چھوٹے داماد ڈاکٹر عشرت چوہدری کا سری نگر سے فون آیا اور خالد حسین کی خریت پوچھنے لگا۔ اُسی نے حادثے کے بارے میں جانکاری دی۔ اللہ کے فضل سے خالد بھائی اور بہن نسیم خیریت سے تھے۔ پورے ہوٹل میں حاجی ڈرے سہمے اور غمگین تھے۔ خُدام اُن کو حوصلہ اور ہمت دینے کیلئے خود ہوٹل میں آئے۔ پوری دُنیا کا میڈیا اِس حادثے سے متعلق خبریں دے رہا تھا۔ خالد بھائی اور بہن نسیم بعد دوپہر حج کی باقی رسوم کی ادائیگی کیلئے خانہ کعبہ چلے گئے۔ طواف اور عمرہ کیا پھر سر کے بال منڈوانے کے لئے خالد حسین نائی کے دُکان پر گئے وہاں لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور نائی تیس ریال ایک حاجی سے وصولی کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر خالد بھائی نے دو ریال کا ایک سیفٹی بلیڈ خریدا اور ایک حاجی سے پوچھا کیا وہ اُس کے سر کے بال صاف کر سکتا ہے۔ جب اُس حاجی نے ہاں میں سر ہلایا تو پہلے خالد حسین نے اُس کی سر کی حجامت کی اور پھر اُس نے خالد حسین کے سر کے بال اتار دیئے یوں دو ریال میں آبِ زم زم سے دونوں نے یہ عمل پورا کیا۔ شام کو خالد حسین تاج محی الدین صاحب سے ملنے اُن کے ہوٹل میں گیا۔ دونوں دیر رات تک باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر عشرت اور ڈاکٹر حما کے بعد خالد بھائی کے بڑے داماد ایوب وانی اور بیٹی ڈاکٹر سمیعہ تبسم کے فون

آئے ۔ دیگر رشتے داروں نے بھی خیریت معلوم کرنے کے لئے رابطہ کیا۔ اللہ کا شکر تھا کہ سب خیریت سے تھے۔ حج کے ارکان مکمل ہو چکے تھے۔ تاج محی الدین اُن کی اہلیہ اور بیٹی مدینہ منّورہ کے لئے روانہ ہو چکے تھے جہاں اُنہوں نے چالیس نمازیں ادا کرنی تھیں۔ اور وہاں سے ہی سری نگر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ جبکہ خالد حسین تحفے تحائف خریدنے میں مشغول ہو گئے۔ اُنہوں نے پچاس سے زیادہ جائے نمازیں خریدیں۔ 80 کلو کھجوریں خریدیں تا کہ رشتے داروں اور دوست احباب میں بانٹی جاسکیں۔ اس کے علاوہ دس لیٹر زم زم کا پانی الگ سے لیا اور دس لیٹر زم زم کا پانی سعودی سرکار نے تبرک کے طور پر دیا۔ تا کہ زم زم اپنے قرابت داروں میں بانٹا جاسکے۔ اس کے علاوہ کئی دوسری چیزیں بھی خریدیں۔ اب ہم سب گھر واپسی کی تاریخ کا انتظار کر رہے تھے۔

مکّہ شریف اور مدینہ منورہ کو مقدس شہروں کا درجہ حاصل ہے۔ حُجاج کرام یہاں اللہ کے مہمان تصور کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں بھی مقامی دکانداروں، ٹیکسی ڈرائیوروں اور کاروباری لوگوں کا رویہ تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ہمارے برصغیر کے ممالک میں ہے۔ بنارس، ہری دوار، دہلی، اجمیر، سری نگر، شملہ وغیرہ شہروں کی طرح یہاں بھی خریداری میں لوٹ کھسوٹ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں رہنے والے کسی غیر ملکی کو شہری حقوق نہیں دیئے جاتے۔ وہ چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو،، عیسائی ہو یا کسی اور مذہب کا ماننے والا ہو۔ وہ سعودی عرب کی شہریت حاصل نہیں کرسکتا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے زیادہ تر لوگ یہاں صاف صفائی کا کام کرتے ہیں۔ خدام حضرات کی ملازمت کرتے ہیں یا دُکانوں پر سیلز مین کا کام کرتے ہیں۔ مشکل سے 15 فیصد لوگ ڈاکٹر، انجینئر یا دیگر ہُنر مند ہوں گے جو برصغیر کے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ دُکانوں کے مالک عربی ہیں اور سارا کاروبار اُن کے نام سے ہی کیا جاتا ہے، چاہے دُکان غیر عربی کی کیوں نہ ہو۔ اگر عربی مالک کے ساتھ کسی بات پر اَن بن ہو جائے یا وقت پر مقرر کردہ رقم عربی کو نہ ملے تو وہ اُس کا سارا سامان دُکان کے باہر پھینک دے گا یا ضبط کرلے گا۔ وہاں کا قانون غیر ملکی کو بچانے کے لئے نہیں آئے گا۔ لہٰذا کوئی بھی غیر ملکی بیوپاری مقامی عربوں سے اُلجھنے میں گریز کرتا ہے۔ برصغیر کے اکثر لوگ ہندوستان کی تقسیم سے بہت پہلے کے وہاں رہ رہے ہیں، جن میں زیادہ تعداد تلنگانہ، آندھرا پردیش اور کیرالہ اور بنگال کے لوگوں کی ہے لیکن کسی کو وہاں کی شہریت حاصل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ڈرے، سہمے رہتے ہیں کیونکہ ملک سے باہر نکالنے کی تلوار اُن کے سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔ مکّہ اور مدینہ میں کام کرنے والے سارے ملازم مسلمان ہیں لیکن اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے

پکڑنا، سبھی مسلمان آپس میں بھائی بھائی، برابری اور برادری کی باتیں کتابوں تک محدود ہیں۔ان کا عملی اظہار بہت کم ملتا ہے۔ مقامی لوگ عربی زبان کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں بول سکتے۔ انگریزی میں بات چیت کرنے والا کوئی اِکّا دُکّا ہی ملے گا۔ جبکہ حجاج کرام میں 99 فیصد لوگ عربی زبان سے نابلد ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہماری مسجدوں کے ممبروں پر واعظ فرمانے والے مولانا اور رٹی رٹائی قرآنی آیات پڑھنے اور اُس کا ترجمہ کرنے والے مولوی صاحبان بھی عربی زبان نہیں بول پاتے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر خالد حسن کا کہنا تھا کہ بھارت سرکار اور خصوصاً مرکزی حج کمیٹی پر یہ لازم ہے کہ وہ حاجیوں کو سعودی عرب بھیجنے سے پہلے حاجیوں کو عربی زبان کی ابتدائی تعلیم بھی ضرور دیں تاکہ وہ ضرورت کی چیزوں کی خریداری کے لئے اور مقامی عربوں کو اپنی بات سمجھانے کے لئے گفتگو کرسکیں اور ٹھگے نہ جائیں۔

سعودی عرب کا فرماں روا خانہ کعبہ کا خادم الحرمین الشریفین بھی ہوتا ہے۔(دیکھ بھال کرنے والا یا سرپرست) ہر سال خانہ کعبہ کا غلاف بدلا جاتا ہے۔ اور نیا چڑھایا جاتا ہے جس پر سونے کی تاروں سے قرآنی آیات کی کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ خادم الحرمین کی اجازت سے اسلامی ممالک کے سربراہان کے لئے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے تاکہ وہ اندر سے زیارت کرسکیں۔ عام حجاج کو اس کی اجازت نہیں ملتی۔ خانہ کعبہ اور حرم شریف کے فرش پر لگے سنگِ مرمر کو ملازم ہر دو دومنٹ کے بعد صفائی مشینوں سے صاف کرتے رہتے ہیں اور پوچا مارتے ہیں۔ ستھرائی کا اعلیٰ انتظام ہوتا ہے۔ غسل خانوں اور پاخانوں کی صفائی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ زمزم کے متبرک پانی کا چشمہ خانہ کعبہ کے باہر والے صحن یا حرم شریف کے بالکل سامنے ہے۔ لاکھوں آدمی یہ پانی اپنے اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ کئی حجاج کفن کے لئے کپڑا خرید کر اُسے زمزم کے پانی سے دھوکر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ فوتگی کے وقت اُن کو وہی کفن پہنایا جائے۔ ہر ملک کے سفارتخانے کا عملہ مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں موجود رہتا ہے۔ اس طرح ہر ملک کے صحت مراکز بھی دونوں جگہ قائم ہیں جہاں بیمار حاجیوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستانی سفارت خانے نے مکہ اور مدینہ میں اپنے حاجیوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے بہترین بندوبست کیا ہوتا ہے۔ بھارتی ڈاکٹر نہ صرف ڈسپنریوں میں حجاج کا علاج کرتے تھے بلکہ ہوٹلوں میں بھی جاکر حاجیوں کا چیک اپ کرتے اور دوائیاں دیتے تھے۔ خالد حسین کو بھی حج کے آخری دِنوں میں نزلہ، زُکام اور کھانسی کا شدید اٹیک ہوا لیکن ڈیوٹی پر تعینات ڈاکٹروں کے بروقت علاج سے وہ چند دِنوں میں ٹھیک

ہو گئے ۔ مکہ اور مدینہ میں انفیکشن کا خطرہ برابر لگا رہتا ہے خاص کر افریقہ اور انڈونیشیا اور کچھ حد تک ملیشیا کے حجاج کرام سے۔

ایک دِن ہمیں ہمارے خُدام کی طرف سے پیغام ملا کہ دوسرے دن ہماری جدّہ کے لئے روانگی ہے۔ چنانچہ خالد حسین اُن کی اہلیہ اور میں نے اپنی بیوی کے ہمراہ الوداعی طواف کیا۔ عمرہ ادا کیا اور دوسرے دن بسوں کے ذریعے ہم پھر جدّہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر لائے گئے۔ جدّہ ہوائی اڈے پر حاجیوں کے سامان کا وزن کیا گیا۔ انڈین ائر لائنز کے ضابطے کی مطابق صرف چالیس کلو وزن لے جانے کی اجازت تھی جبکہ بھائی خالد حسین کے سامان کا کل وزن ایک سو کلو گرام سے زیادہ تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے 40 کلو وزن کا سامان رکھ کر باقی کے سامان کی بُکنگ کارگو میں کروائی جس پر اتنی رقم خرچ ہوئی کہ دھیلی کی بُڑھیا ٹکا سر مُنڈ وائی والی بات ہوگئی اور سمجھ میں آ گیا کہ بلا ضرورت کچھ نہ خریدا جائے۔ خالد حسین کا یہ بھی کہنا تھا کہ حج جوانی میں کیا جائے کیونکہ حج کا عمل انتہائی مشکل ہے ،خاص کر بزرگ لوگوں کے لئے۔ خیر جدّہ سے ہماری فلائٹ سری نگر پہنچی اور دوسرے دِن ہم سب جموں کے لئے روانہ ہوئے۔ اس طرح بھائی خالد حسین کے ساتھ میرا 45 دِنوں کا ساتھ دلچسپ رہا۔ مکہ اور مدینہ میں ہم نے وہ سارے مقامات دیکھے جو اسلامی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ لیکن بھائی خالد کو اس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ سعودی عرب کی موجودہ شاہی حکومت بیشتر تاریخی مقامات کو مسمار کر رہی ہے۔ اُن قبرستانوں کو اُجاڑ رہی ہے جہاں صحابہ دفن ہیں۔ قبرستانوں کے نیچے سے سڑکیں نکالیں گئی ہیں۔ مسجد الحرام کو وسعت دینے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ ، بی بی خدیجہؓ اور تو اور حضرت محمدؐ کا آبائی گھر بھی مسمار کر دیا گیا ہے۔ وہاں سڑکیں، بڑے بڑے مال اور نئی مسجدیں بنائی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں Myth کو مذہب کی بنیاد بنایا جاتا ہے لیکن وہاں اسلام کے حقیقی ثبوتوں کو مٹایا جا رہا ہے:

میرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت
کریم تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے

(نامعلوم)

☆☆☆

دل دریا بہتا جائے

کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو خجل کیا وہ پوچھتے ہیں کہیے اِرادے کِدھر کے ہیں (داغؔ دہلوی)

خالد حسین معیاری ادبی تخلیق کے عاشق تھے۔ سبق آموز فلمیں دیکھنا، اچھا سنگیت اور رُوح کو معطر کرنے والی گائیکی سننا، زندگی سے جُڑے ڈرامے دیکھنا، اچھی شاعری پڑھنا اور مشاعرے سُننا اُن کے شوق تھے۔ مہدی حسن، غلام علی، ریشماں، عابدہ پروین، فریدہ خانم اُستاد حامد علی اُستاد نصرت فتح علی، طفیل نیازی، شوکت علی اور عارف لوہار کو سننے کے لئے خالد حسین کئی بار پنجاب کے اُس شہر میں جاتے جہاں اِن فنکاروں کا پروگرام ہوتا۔ ادب، فن اور فنکاروں کے لئے یہ اُن کا جنُون ہی تھا کہ اُنہوں نے اپریل 2004 میں لاہور کے الحمرہ آڈیٹوریم میں اجوکا تھیٹر لاہور کی طرف سے کھیلا گیا پنجابی ڈرامہ ''بُلھا'' دیکھا، جسے سوپور کے کشمیری سپُوت شاہد ندیم نے لکھا تھا اور اُس کی بیگم مدیحہ گوہر نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ بُلھے شاہ کی پنجابی صوفیانہ شاعری کو بنیاد بنا کر اس ڈرامے کا شاندار سکرپٹ لکھا گیا تھا، اور اداکاروں کے ساتھ ساتھ گلوکار اپنی آواز میں بلھے شاہ کا کلام گا رہے تھے جو کہ ڈرامے کی عام روایت سے ہٹ کر تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے پر خالد حسین مدیحہ گوہر سے ملے اور بتایا کہ وہ جموں سے عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ''بلھا'' ڈرامہ جموں میں کھیلا جائے۔ وہ تیار ہوگئیں اور کہنے لگیں کہ اُن کے تھیٹر گروپ میں تقریباً 26 ممبران ہیں جو جموں آئیں گے۔ پھر اُنہوں کہا کہ جولائی 2004ء میں وہ امرتسر اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ آ رہی ہیں باقی کی تفصیلی بات وہاں آ کر کریں گے۔ ایک دِن امرتسر سے اُن کا ٹیلیفون آیا اور مجھے امرتسر بُلایا اور کہا کہ اُن کی نئی پروڈیکشن ''ایک تھی نانی'' ضرور دیکھیں اور جموں میں 'بلھا' اسٹیج کرنے سے متعلق بھی بات چیت ہوگی چنانچہ خالد حسین اپنی اہلیہ اور بڑی بیٹی ڈاکٹر سمیہ تبسم، اپنے دوست ڈاکٹر للت گپتا اور مجھے ساتھ لیکر اُسی روز امرتسر پہنچے جس شام ''ناٹ شالا'' امرتسر میں ''ایک تھی نانی'' کھیلا جا رہا تھا۔ مدیحہ گوہر جی نے ہم سب کا خیر مقدم کیا اور منتظمین سے کہا کہ وہ ہمارے رہنے کا بندوبست کریں۔ شام کو ہم نے شاہد ندیم کا لکھا ہوا اور مدیحہ گوہر کا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈرامہ ''ایک تھی نانی'' دیکھا۔ اُس ڈرامے میں تھیٹر اور فلم کی مشہور ہندوستانی اداکارہ زُہرہ سہگل اور اُس کی سگی بہن عذرا بٹ جو لاہور میں رہتی تھیں، نے دادی اور نانی کا کردار نبھایا تھا۔ اُن کی پوتی اور ناتی کا کردار

نبھانے والی اداکارہ عذرا بٹ کی پوتی اور زہرہ سہگل کی حقیقی ناتی تھی۔ اُس وقت زُہرہ سہگل کی عمر 93 سال تھی لیکن مکالموں کی ادائیگی اور ہر سین میں لباس تبدیل کر کے اسٹیج پر آنا یہ سب اداکاری کے لئے اُن کے جنُون کی انتہا تھی۔ یہی حال اُن کی 88 سالہ بہن عذرا بٹ کا تھا۔ دونوں چست اور درست تھیں۔ ڈرامہ پرُانی اور نئی نسل کے تضاد کی کہانی پر تیار کیا تھا۔ کمال کی اداکاری اور ہدایت کاری تھی ڈرامہ ختم ہونے پر ناظرین نے بھرپور تالیوں کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ڈرامہ دیکھنے والوں میں مشہور فلمی اداکارہ دیپتی نول بھی تھیں۔ جب اُن کو اسٹیج پر بلایا گیا اور ڈرامے کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے کہا گیا تو وہ رونے لگیں، سسکیاں بھرنے لگیں اور کچھ بھی نہ بول سکیں۔ رات کو کھانے پر مدیحہ جی سے بات ہوئی اور طے پایا کہ ''بلھا'' جموں میں کھیلا جائیگا جس کے لئے دو لاکھ روپئے دیے جائیں گے۔ واپسی کے سفر میں خالد حسین مجھ سے کہنے لگے کہ مالی معاونت کا انتظام تو ہوجائے گا لیکن لاہور سے آرٹسٹوں کو جموں لانے کا مسئلہ ہوگا کیونکہ ہماری سرکار جموں کشمیر کے لئے پاکستانیوں کو ویزا نہیں دیتی۔ میرا نام ڈاکٹر لیاقت جعفری ہے اور میں بطور اردو شاعر برصغیر میں اپنی شناخت رکھتا ہوں۔ میں خالد حسین جی کو اُن دِنوں سے جانتا ہوں جِن دنوں وہ پونچھ میں اے، سی، ڈی تعینات تھے۔ میں نے اُن کے دو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگری کا دُھواں'' اور ''اشتہاروں والی حویلی'' پڑھے تھے۔ پھر وہ پونچھ میں ڈپٹی کمشنر بنکر آئے تو اُن کی محبت مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو حاصل ہوئی۔ میرے علاوہ سوامی انتر نیرو، خالد میر اور انور خان وغیرہ کے ساتھ روز ادبی مناظرے ہوتے۔ گیت سنگیت کے پروگرام کرائے جاتے۔ مشاعرے ہوتے۔ نامور شعراء کو دعوت دی جاتی۔ پھر میری پوسٹنگ جموں کے ایک ڈگری کالج میں بطور اردو لیکچرار ہوئی۔ اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے خالد صاحب کو مشورہ دیا کہ جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امتیابھ مٹو سے بات کی جائے۔ شاید وہ ہماری کچھ مدد کریں۔ ہم دونوں امتیابھ مٹو صاحب سے ملے اور بتایا کہ جموں میں پاکستانی پنجابی ڈرامہ ''بُلھا'' کا ایک شو کرانا چاہتے ہیں جس کے لئے اُن کی مدد چاہئے تاکہ پاکستانی آرٹسٹوں کا ویزا لگوایا جاسکے۔ میں نے مٹو صاحب کو بتایا کہ لاہور کا مشہور تھیٹر گروپ ''اجوکا'' پنجابی صوفی شاعر بلُھے شاہ کی زندگی پر لکھا گیا ڈرامہ ''بُلھا'' جموں میں کھیلے گا۔ وائس چانسلر امتیابھ مٹو بہت خوش ہوئے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسائل کو حل کرنے والی ٹریک ٹو ڈپلومیسی میں شامل تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ پاکستانی ڈرامہ جموں میں دکھانے سے لوگوں کو آپس میں ملنے کا موقع ملے گا اور یہ اعتماد بحال کرنے کی سمت ایک اہم سنگ میل ہوگا۔ انہوں نے

اُسی وقت مرکزی سرکار کے امورِ خارجہ کے سکریٹری سے ٹیلیفون پر رابطہ کیا اور 26 فنکاروں کو جموں کا ویزا جاری کرنے کے لئے کہا۔ پھر وہ ہم سے کہنے لگے کہ سبھی آرٹسٹ جموں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے اور یونیورسٹی کے طرف سے ایک لاکھ کی رقم بھی دی جائے گی۔ یعنی جموں یونیورسٹی نے 'بلھا' ڈرامے کو سپانسر کرنا منظور کرلیا۔ اس طرح 'بلھا' کلچرل اکادمی جموں کے ابھینو تھیٹر میں 29 جنوری 2005 کو کھیلا گیا، جسے دیکھنے کے لئے پورا جموں شہر اُمڈ آیا تھا۔ اس ڈرامے میں پہلی بار بلھے شاہ کی کافیاں مشہور پاکستانی قوال اور میوزک ڈائریکٹر اُستاد جاوید بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے اسٹیج پر بیٹھ کر گائی تھیں۔ جو کہ ڈرامہ کا حصہ تھیں۔ ان کافیوں کو کرداروں کے مکالموں کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ جاوید بشیر نے بعد ازاں موسیقار اے، آر، رحمن کے ساتھ بھی کام کیا۔ فلم راک سٹار کی قوالی کی دُھن جاوید بشیر نے ہی بنائی تھی۔ کوک اسٹیڈیو کے کئی گانے بھی اُنہوں نے گائے ہیں۔ بُلھے شاہ کا کردار سرفراز انصاری نے نبھایا تھا اور ان کے مرشد شاہ عنایت کا کردار پاکستان فلم، ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے مشہور اداکار عاصم بخاری جی نے نبھایا تھا۔ اس ڈرامے کے تقریباً سبھی اداکار ٹیلی ویژن سے وابستہ تھے۔ کئی ایک نے تو پاکستان کی مشہور اردو فلم ''بول'' میں بھی کام کیا تھا۔ ڈرامے کو بے حد پسند کیا گیا۔ دوسرے دن مقامی اخباریں 'بلھا' ڈرامے کی تعریفوں سے بھری پڑی تھیں۔ اخباریں پڑھ کر جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امیتابھ مٹو کو ریاست کے گورنر جنرل سنہا صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے ڈرامہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسی طرح خالد حسین جی کو بھی گوجر برادری کے ایک بڑے لیڈر اور بابا نگری وانگت (کنگن کشمیر) کے گدّی نشین میاں بشیر صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے بھی 'بلھا' ڈرامہ دیکھنے کے لئے کہا۔ کچھ اعلیٰ سرکاری افسران نے بھی گذارش کی۔ ڈاکٹر امتیابھ مٹو اور خالد حسین نے مدیحہ گوہر صاحبہ کو ڈرامہ دوبارہ اسٹیج کرنے پر آمادہ کرالیا۔ چنانچہ 30 جنوری 2005 کو ''بلھا'' دوبارہ کھیلا گیا۔ میاں بشیر صاحب اپنے کئی مریدوں کے ہمراہ آئے جبکہ گورنر جنرل سنہا اپنی اہلیہ اور گورنر ہاؤس کے عملے کے ساتھ تشریف لائے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ ڈرامے کے پہلے سین سے ہی میاں بشیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے شروع ہوئے اور آخر تک وہ ''بلھے شاہ'' کی کافیوں کے سحر میں ڈوبے رہے۔ ڈرامہ ختم ہونے پر گورنر جنرل سنہا نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''بُلھا'' ڈرامہ برصغیر کی صوفی پرمبرا کا پرتیک ہے۔ ایسے ڈرامے اور سنگیت کے پروگرام دونوں ملکوں میں تواتر سے کرائے جانے چاہیں کیونکہ ہمارا ورثہ، زبان اور کلچر ایک ہے۔ دونوں ممالک کے ادیبوں اور فنکاروں کو ایک دوسرے کے

ملک میں آنے جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔انہوں نے دونوں سرکاروں سے گذارش کہ اعتماد بحالی کے لئے اور رشتوں کو خوشگوار بنانے کے لئے مزید تمدنی پروگرام کرائے جائیں جبکہ حضرت میاں بشیر صاحب نے خالد حسین سے کہا کہ ڈرامے کے سبھی اداکاروں کو وہ کل شام کھانے پر بلانا چاہتے ہیں۔اُن کی طرف سے تمام مہمانوں کو دعوت دے دیں۔ میں نے اور خالد صاحب نے مدیحہ گوہر صاحبہ سے کہا کہ جموں وکشمیر کی ایک برگزیدہ شخصیت نے آپ کو اور اجوکا تھیٹر گروپ کے سبھی کلاکاروں کو کل رات عشایہ پر بُلایا ہے۔جبکہ صبح ناشتے پر گورنر صاحب نے اُن کو دعوت دی تھی۔گورنر ہاؤس جموں میں مدیحہ گوہر، امیتابھ مٹو اور ہم دونوں اُن کے ساتھ گئے۔ناشتہ پر مدیحہ گوہر جی نے کہا کہ وہ بھی ایک میجر جنرل کی بیٹی ہیں اور اُنہوں نے تھیٹر ڈائریکشن کی تعلیم لندن سکول آف ڈرامہ سے حاصل کی ہے تو جنرل سنہا اپنی جوانی کے دِنوں کی باتیں سنانے لگے جب وہ پشاور کی ایک آرمی رجمنٹ میں کیپٹن تھے اور جنرل یحییٰ خان اُن کے سنیئر تھے یعنی میجر۔پھر وہ جنرل یحییٰ خان کے قصے سنانے لگے کہ کس طرح بلا اجازت وہ اُن کی فوجی موٹر سائیکل لے کر بازار چلے گئے لیکن جنرل سنہا پکڑے گئے کیونکہ موٹر سائیکل اُن کی تھی، پھر اپنے والد جو اُس وقت کراچی پولیس کے کمشنر تھے، کی سفارش پر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا تھا۔ایک اور دلچسپ واقعہ اُنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے سنایا کہ جب جنرل کے ایس تھمیا اور جنرل یحییٰ خان دونوں ہندوستانی فوج میں میجر اور بریگیڈیئر تھے اور جنگی قیدی بنا کر ترکی کے ساحل سمندر پر لائے گئے تھے۔تو ایک دن میجر یحییٰ خان چپکے سے جنگی کیمپ سے بھاگ نکلے۔کسی نے اُن کا نوٹس نہیں لیا کیونکہ وہ گورے چٹے، بالکل انگریزوں کی طرح لگتے تھے جبکہ بریگیڈئر کے ایس تھمیّا کالے رنگ کے تھے۔اس لئے وہ جنگی کیمپ سے باہر جاتے تو پکڑے جاتے۔ناشتے پر اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔جنرل سنہا بہت خوش تھے۔اُنہوں نے اُن دِنوں کو یاد کیا جو انہوں نے پاکستان کے شہروں میں گزارے تھے۔رات کو میں میاں بشیر صاحب کے دولت خانے ودھاتا نگر بٹھنڈی میں مدیحہ گوہر صاحبہ اور اُن کی ٹیم کو لے گیا۔اُنہوں نے اپنے کچھ دوستوں، سیاسی اور سماجی شخصیات کو بھی دعوت دی تھی۔دعوت کے لئے کشمیری پکوان ''وازوان'' بنانے کیلئے سری نگر سے خصوصی طور پر وازے (کشمیری کھانے بنانے والے) منگوائے گئے تھے۔بابا نگری وانگت کے سجادہ نشین میاں بشیر صاحب کے فرزند اور ریاستی سرکار میں وزیر میاں الطاف حسین صاحب مہمانوں کی خدمت خود کر رہے تھے۔(میاں الطاف ایک درویش صفت انسان ہیں اور میاں صاحب نے اپنی زندگی میں ہی انھیں اپنے اجداد (یعنی حضرت

عبداللہ لاروی اور حضرت نظام الدین لاروی) کی گدی کا جانشین نامزد کیا ہے کیونکہ وہ حق اور سچ کی مورت ہیں ۔صوفیانہ شاعری اور عمدہ گائیکی کے شوقین ۔میاں الطاف صاحب میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک گدی نشین میں ہونی چاہیں) واز وان بہت لذیز بنا تھا۔ پاکستانی فنکار پہلی بار واز وان سے آشنا ہوئے تھے ۔کھانے کے کے بعد میاں بشیر صاحب نے مدیحہ گوہر کو پشمینہ کا ایک ''دُسہ'' (دوہری چادر) شاہ عنایت کا کردار نبھانے والے مشہور ٹیلی ویژن ایکٹر عاصم بخاری کو پشمینہ کا چوغہ اور بُلھے شاہ کا کردار نبھانے والے سرفراز انصاری کو شیروانی تحفے میں دی ۔مجلس اختتام پذیر ہوئی تو خالد حسین اور میں نے مہمانوں کو یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں پہنچایا ۔دوسرے دن اجوکا گروپ کے کلاکار براستہ واہگہ بارڈر لاہور کے لئے روانہ ہوگئے ۔(اگست 2021ء کو حضرت میاں بشیر صاحب رحلت فرما گئے ۔اللہ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند کرے ۔)

خالد حسین کے بچپن کے دوست اور آئی ، اے ، ایس (ریٹائرڈ) محمد اسلم قریشی ایک دن اُن کے گھر آئے اور کہنے لگے کہ کچھ دِن پہلے وہ ریاست کے سابق صدرِ ریاست ، سابق گورنر ، سابق مرکزی وزیر اور انڈین کونسل برائے کلچر ریلیشن کے چیئرمین ڈاکٹر کرن سنگھ جی سے ملنے جھیل ڈل کے کنارے پہاڑی پر بنے اُن کی پیلس میں گئے تھے اور وہاں برصغیر کے مشہور انقلابی اور رومانی شاعر فیض احمد فیض کے سو سالہ جشن ولادت کے سلسلہ میں ایک خصوصی پروگرام جموں میں منعقد کرانے کی بات چلی تو ڈاکٹر کرن سنگھ جی نے کہا کہ وہ فیض کی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اگر وہ جموں میں عالمی معیار کا جشنِ فیض پر گروام کروائیں تو وہ انڈین کونسل برائے کلچر ریلیشن کی طرف سے مالی مدد دینے کو تیار ہیں ۔خالد حسین اور اسلم قریشی نے پروگرام کی روپ ریکھا بنائی اور یہ طے ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان سے دس دس معروف شعراء کو مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی جائے ۔فیض صاحب کی بیٹیوں کو بھی تقریب میں شرکت کرنے کیلئے بُلایا جائے اور پاکستان سے مشہور گلوکار غلام علی یا عابدہ پروین کو مدعو کیا جائے ۔خالد حسین کے مشورے سے ''جموں سول سوسائٹی فار آرٹ اینڈ لٹریچر'' کے نام سے ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم بنائی گئی جسے سرکار سے رجسٹرڈ کرایا گیا ۔سرپرست ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے پہلے وائس چانسلر جناب مسعود چوہدری کو بنایا گیا جو جموں وکشمیر گوجر ٹرسٹ کے بھی سرپرست تھے اور اُنہوں نے گوجر طبقہ کی تعلیم اور بہبود کے لئے مثالی کام کئے تھے ۔محمد اسلم قریشی کو صدر اور خالد حسین کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا ۔مجھے آرگنائزر اور سیکرٹری چُنا گیا جبکہ اُردو روزنامہ تسکین کے مدیر سہیل کاظمی صاحب کو نائب

صدر بنایا گیا۔ممبران میں ڈاکٹر للت مگوترہ، صدر ڈوگری سنستھا جموں، اردو شاعر بلراج بخشی اور رویندر کول صاحب کو لیا گیا۔ میں نے پاکستان کے شعراء افتخار عارف، امجد اسلام امجد، ایوب خاور ،انور مسعود، کشور ناہید، اعزاز ،احمد آذر، افضل ساحر، علی اکبر ناطقؔ، منظر نقوی، عشرت آفرین وغیرہ سے رابطہ قائم کیا اور علی اکبر ناطقؔ سے گذارش کی کہ وہ پاکستانی شعراء کے پاسپورٹ، شناختی کارڈ کی فوٹو کاپیاں مجھے میل کر دیں۔ میں نے فیض صاحب کی بیٹی محترمہ سلیمہ ہاشمی سے وٹس ایپ اور ای میل کے ذریعہ رابطہ قائم کیا، وہ بھی بخوشی جموں آنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ سول سوسائٹی کے دفتر کے لئے سہیل کاظمی صاحب نے تسکین Complex میں جگہ فراہم کر دی۔ خطوط لکھنے کا تقریباً سارا کام خالد حسین جی نے کیا۔ خطوط کے مضامین کی نوک پلک سنوارنے کی غرض سے کبھی کبھی مسعود چوہدری اور محمد اسلم قریشی نے بھی مفید مُشورے دیئے۔ توسیفی پیغامات کیلئے صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم، ریاستی گورنر اور وزیر اعلیٰ اور ڈاکٹر کرن سنگھ جی کو خطوط لکھے گئے۔ پاکستانی مہمانوں کو جموں لانے کی اجازت کے لئے مرکزی وزارتِ خارجہ اور داخلہ کے سیکرٹری صاحبان کو لکھا گیا، اور گذارش کی گئی کہ اُنھیں جموں کے لئے ویزا جاری کیا جائے۔ ہندوستان سے بُلائے جانے والے شاعروں سے میں نے رابطہ کیا اور ای میل کے ذریعے دعوت نامے بھی بھیج دیئے۔ خالد حسین اور محمد اسلم قریشی دہلی گئے اور وزارت خارجہ کے دفتر میں گئے جہاں خالد حسین کے ایک دوست شری کے، کے سنہا(آئی، اے، ایس پنجاب کیڈر) جوائنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر براجمان تھے۔ اُنہوں نے آدھے گھنٹے میں اجازت نامہ دے دیا۔ پھر وہ دونوں وزارت داخلہ کے سپیشل سیکرٹری شری انل گوسوامی (جموں وکشمیر کیڈر کے آئی، ایس افسر جو بعد ازاں سیکرٹری داخلہ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) سے ملے۔ اُنھیں جشنِ فیض پروگرام کی پوری تفصیل بتائی اور پاکستانی مہمانوں کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپیاں پیش کیں۔ خالد حسین نے شری انل گوسوامی کے ساتھ کام کیا تھا بلکہ 81-1980ء کے وقت سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے جب خالد حسین ریاسی ضلع کے بلاک ارناس کے بلاک افسر تھے اور انل گوسوامی صاحب ریاسی کے ایس، ڈی، ایم تھے۔ پھر جب خالد حسین ضلع پونچھ کے ڈپٹی کمشنر تھے تو گوسوامی صاحب جموں صوبہ کے ڈویژنل کمشنر تھے۔ اُنہوں نے ہوم منسٹری میں جموں کشمیر سیل کے افسروں کو بلایا اور کہا کہ وہ دونوں افسروں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ اس لئے پاکستانی مہمانوں کو ویزا جاری کرنے کی کارروائی عمل میں لائی جائے اور خالد حسین سے کہا کہ وہ کوئی اپنا نمائندہ دہلی میں چھوڑ جائیں جو اُنھیں یاد دلاتا رہے۔ چنانچہ دہلی

یونیورسٹی کے ڈاکٹر مشتاق قادری (جو ضلع پونچھ کے رہنے والے ہیں) کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ متعلقہ افسران کے رابطے میں رہیں۔ اِس سے پہلے خالد حسین خود پاکستان گئے اور فرداً فرداً سبھی شعراء سے ملاقات کر کے اُنھیں دعوت نامے دیئے۔ وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں فیض صاحب کی دُختر محترمہ سلیمہ ہاشمی سے ملے۔ وہ گلوکار غلام علی سے ملے، غلام علی صاحب نے پروگرام کیلئے 12 لاکھ کا معاوضہ طلب کیا۔ جو کہ ہماری بساط سے باہر تھا۔ عابدہ پروین صاحبہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن اُنہوں نے 15 لاکھ روپئے کی خطیر رقم مانگی۔ اُن حالات میں خالد حسین جناب فخر زماں (مشہور ناولسٹ اور شاعر) سے اُن کے دولت خانے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ملے جہاں خالد حسین کھانے پر مدعو تھے۔ جب خالد صاحب نے اپنی مشکل بیان کی تو اُنہوں نے پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائک اُستاد حامد علی خان صاحب کا نام تجویز کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اپنی گائکی کی وجہ سے مدتوں تک جموں والوں کو یاد رہیں گے۔ پھر اُنہوں نے اُستاد حامد علی خان سے فون پر رابطہ کیا اور اُنہیں اپنے گھر بلایا۔ خان صاحب سے مل کر ساری بات طے ہوگئی۔ اُن کے ساتھ معاملہ تین لکھ روپئے میں طے ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اپنے ہمراہ اپنے بیٹے نایاب علی خان اور ماموں جاوید فیض کو لائیں گے۔ جن کے لئے الگ سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ اب سب سے بڑا مسئلہ چندہ جمع کرنے کا تھا۔ مسعود چوہدری صاحب نے تو صاف انکار کر دیا کہ وہ چندے کے معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جب کہ محمد اسلم قریشی نے بیس پچیس لاکھ رقم جمع کرنے کی پیشن گوئی کی اور کہا کہ ساری عمر اُنہوں نے جموں کے صنعت کاروں، سیاسی لیڈروں اور اعلیٰ افسروں کی خدمت کی ہے۔ لہٰذا اُن کے لئے رقم اکٹھا کرنا معمولی بات ہے لیکن وہ سردار سُدرشن سنگھ وزیر سے صرف 31 ہزار روپئے لینے میں کامیاب ہوئے اور اپنے دونوں بیٹوں سے 35 ہزار روپئے لے سکے۔ مسعود چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی محمود چوہدری نے بڑی مشکل سے 20 ہزار روپئے دیئے۔ سہیل کاظمی صاحب نے اپنے ذاتی رسوخ سے ڈائریکٹر جنرل پولیس شری کلدیپ کھڈا سے ایک لاکھ روپئے وصول کیے۔ جبکہ باقی کی ساری رقم خالد حسین نے اکٹھا کی۔ انہوں نے اپنے دوست تاج محی الدین سے دو لاکھ روپیہ، چندی گڈھ کے صنعت کار وجے میتل جی سے ایک لاکھ، نر بھے ترہن، وویک مہتہ، سُنیل گپتا، بلدیو راج ڈوگرہ، اجے آنند، چوہدری نذیر احمد اور عوامی نیشنل کانفرنس کے روحِ رواں مظفر شاہ سے پچاس پچاس ہزار روپئے حاصل کئے۔ 5 لاکھ کا چیک انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن نئی دہلی کی طرف سے ڈاکٹر کرن سنگھ جی کی وساطت سے ملا۔ باقی کے 5 لاکھ انہوں نے پروگرام ختم ہونے اور اخراجات کا آڈٹ شدہ تخمینہ دیکھنے کے بعد دینے

کا وعدہ کیا تھا۔ ڈی جی پی جناب کلدیپ کھڈا نے پولیس گیسٹ ہاؤس بھی مہمانوں کے ٹھہرنے کیلئے دے دیا، لیکن ہمنے اُس میں ہندوستانی شاعروں کو رکھا جبکہ پاکستانی مہمانوں کیلئے ہوٹل جہلم ریزارٹ باہُو بلازہ بُک کیا گیا۔ پاکستانی مہمانوں کو لانے کیلئے خالد حسین اور رویندر کول صاحب واہگہ بارڈر پر گئے۔ افتخار عارف بیماری کی وجہ سے نہ آسکے۔ افضل ساحر بھی کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے جبکہ امجد اسلام امجد صاحب کو ویزا نہیں مل سکا کیونکہ اُن کے پاسپورٹ میں درج ایڈریس اُن کے فارم کے مطابق نہیں تھا۔ باقی سبھی مہمان وقتِ مقررہ پر واہگہ باڈر پار کر کے آچکے تھے۔ محترمہ سلیمہ ہاشمی کا پیغام مِلا کہ وہ آرٹ کالج کے سالانہ فنکشن کے بعد روانہ ہوں گی۔ اس لئے خالد حسین نے ان کے لئے ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا اور کسٹم حُکام سے گذارش کی کہ وہ محترمہ سلیمہ ہاشمی کو ٹیکسی میں جموں کے لئے روانہ کردیں، جس کے لئے ٹیکسی ڈرائیور کو مقررہ رقم ادا کردی گئی تھی۔ امرتسر میں دوپہر کا کھانا مشہور صحافی رشمی تلوار کی طرف سے کھلایا گیا۔ اُس کے بعد جموں کا سفر شروع ہوا۔ اُستاد حامد علی خان صاحب کو خالد حسین نے اپنی کار میں بیٹھا لیا اور اُنھیں کہنے لگے کہ وہ جموں میں کوئی ڈوگری گیت بھی سُنائیں۔ جموں والوں پر اچھا اثر پڑے گا تو وہ کہنے لگے کہ ملکہ پکھراج اُس کے چچا اُستاد عاشق حسین خان کی شاگرد تھیں اور ایک ڈوگری گیت ''پل بھر بھئی جانا'' گاتی تھی۔ اگر اُس گیت کے بول اُنھیں لکھوائے جائیں تو وہ گادیں گے۔ خالد حسین نے جموں ڈاکٹر للت مگوترہ کو فون ملایا۔ اُس نے پورا گیت لکھوایا۔ پھر خان صاحب کہنے لگے کہ خالد حسین اُن کے ساتھ گائیں تاکہ گانا یاد ہوجائے۔ اُستاد حامد علی خان عالمی شہرت یافتہ پاکستانی کلاسیکل سنگر ہیں۔ اُن کے والد چچا سب اُستاد فنکار تھے۔ فلم مغل اعظم میں اُن کے دادا ابو کے بھائی اُستاد بڑے غلام علی خان نے کلاسیکل گیت گائے تھے۔ اُن کے برادر اُستاد فتح علی اور اُستاد امانت علی تھے۔ امانت علی کے بیٹے اسد امانت علی اور شفقت امانت علی اُن کے بھتیجے ہیں اُن کے اپنے تین بیٹے بھی گاتے ہیں۔ خیر مکریاں تک اُنھیں ملکہ پکھراج کا مشہور نغمہ ''پل بھر بھئی جانا'' یاد ہوگیا۔ راستے میں خالد حسین کو ڈوگری کی شاعرہ، وِجیا ٹھاکر اور پھر ڈپٹی کمشنر کٹھوعہ محترمہ زاہدہ خان کا فون آیا کہ اُنہوں نے کٹھوعہ کے ہائرسیکنڈری سکول میں مہمانوں کے لئے استقبالیہ رکھا ہے۔ لہٰذا وہ کٹھوعہ میں رک کر جائیں۔ خالد صاحب نے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن ڈی۔سی، صاحبہ نہیں مانیں۔ مجبوراً ہمیں کٹھوعہ میں رُکنا پڑا کیونکہ وہ خود راستہ روک کے بیٹھی تھیں۔ کٹھوعہ ضلع کی پوری انتظامیہ اور پولیس کے افسران و معزز شہری ہائرسیکنڈری سکول میں جمع تھے۔ مہمانوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ گلدستے پیش کئے گئے۔ رنگا رنگ

کلچر پروگرام پیش کیا گیا۔ خلوص میں ڈوبی چائے پلائی گئی۔ پاکستانی مہمان ریاست میں داخل ہوتے ہی اس بھرپور سواگت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خالد حسین نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور ضلع انتظامیہ کے افسران کا تعارف مہمانوں سے کرایا۔ پھر یہ قافلہ جموں کے لئے روانہ ہوا۔ جموں پہنچتے ہی جہلم ریزارٹ میں اخباری اور ٹیلی ویژن چینلوں کے رپوٹروں کی بھیڑ نے پاکستانی مہمانوں کو گھیر لیا اور انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ جن ہندوستانی شعراء کو دعوت دی گئی تھی، اُن کے اسمائے گرامی تھے۔ گلزار، جاوید اختر، ندا فاضلی، وسیم بریلوی، انور جلال آبادی، اشوک ساحل، نواز دیوبندی، فیاض فاروقی (آئی، پی، ایس) سردار پنچھی، طاہر فراز اور خوشبیر سنگھ شاد، جموں وکشمیر کے کسی بھی شاعر کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ جس پر سبھی مقامی شعراء سخت ناراض تھے۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ پاکستانی شعراء کے ساتھ دِن میں اُن کی ملاقات اور شعر وسخن کی محفل سجانے کے لئے تین گھنٹے کا وقت رکھا گیا ہے اور وہ اُن سے شعر وادب پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بضد تھے کہ اُنھیں مشاعرے میں کلام پڑھنے کا موقع دیا جائے جو کہ ناممکن تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے شعراء کی تعداد بیس تھی۔ اسی لئے فیصلہ لیا گیا تھا کہ کوئی بھی مقامی شاعر نہیں پڑھے گا۔ پرتپال سنگھ بیتاب تو آپے سے باہر ہو کر بُرا بھلا بھی کہہ رہا تھا۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر خلیق انجم، تحریکِ ادب وارانسی کے مدیر جاوید انور، ساہت اکادمی کے اُردو شعبہ سے عارف مسعود اور مشتاق صدف بھی تشریف لائے تھے ہندوستان میں ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر بھی ''جشن فیض'' کی تقریب میں حصہ لینے آئے تھے۔ کتھک ڈانسر رِچا جین اور پنجابی گائک جا گیر سنگھ بھی اس پروگرام میں شامل تھے۔ چوہدری مسعود کی دیکھ ریکھ میں دعوتی کارڈ تقسیم ہوئے۔ آدھے سے زیادہ دعوت نامے ایس، ایس، پی جناب شریف چوہان نے تقسیم کروائے۔ اور ہمارے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔ چوہدری مسعود صاحب نے ہماری ساری ٹیم کو نظم وضبط میں رکھا۔ محمد اسلم قریشی، خالد حسین اور مسعود چوہدری صاحب وزیر اعلیٰ جناب عمر عبداللہ کو خود مدعو کرنے گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اُنہوں نے پاکستانی وہندوستانی مہمانوں کو عشائیہ دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اور ''جشن فیض احمد فیضؔ'' کی افتتاحی تقریب کا مہمانِ خصوصی بننا بھی قبول کر لیا۔ 10 ر دسمبر 2011ء کو جموں یونیورسٹی کے جنرل زور آور سنگھ آڈیٹوریم میں صبح دس بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مسعود چوہدری صاحب نے استقبالیہ پڑھا۔ بعد ازاں وزیر اعلیٰ جناب عمر عبداللہ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے جموں سول سوسائٹی فار آرٹ اینڈ لٹریچر کی تعریف کی اور کہا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان غلط فہمیاں اور دُوریاں ختم ہونی چاہئیں۔ اس مقصد کے

لئے ایسے پروگرام کرنے بہت ضروری ہیں۔اُنہوں نے مزید کہا کہ یہ کام ریاستی کلچرا کادمی یا جموں یونیورسٹی نے کرنا چاہئے تھا لیکن وہ نہ کر سکے۔وزیر اعلیٰ نے پاکستانی مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ وہ واپس جاتے وقت ہمارے پیار،خلوص،مہمانوازی اور امن کی خواہش کا پیغام لے کر جائیں ۔اُنہوں نے بتایا کہ فیض احمد فیضؔ اور اُن کے دادا ابو شیخ محمد عبداللہ گہرے دوست تھے۔دادا جان فیض کی شاعری کے دِلدادہ تھے۔فیض صاحب کے نکاح میں دادا جان اُن کے وکیل تھے اور وہ نکاح سرینگر میں شری امر سنگھ کالج کے رہائشی بلاک میں ہوا تھا۔ جہاں امر سنگھ کالج کے پرنسپل اور فیض صاحب کے ہم زُلف اور پاکستانی پنجاب کے سابقہ مقتول گورنر سلمان تاثیر کے والد پروفیسر محمد دین تاثیر رہتے تھے۔فیض صاحب کی بیوی ایلیس اور پروفیسر محمد دین تاثیرؔ کی بیگم دونوں سگی بہنیں انگریز تھیں اور صرف انگریزی زبان ہی بول سکتی تھیں جبکہ عمر عبداللہ صاحب کی دادی بیگم اکبر جہاں (مادرِ مہربان) بھی انگریز باپ کی بیٹی تھیں۔وزیر اعلیٰ کے خطاب کے بعد پٹیالہ گھرانے کے استاد حامد علی خان نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔جنرل زورآور سنگھ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔جموں کی سول سوسائٹی ، یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسر،مقامی ادیب اور شعراء اور موسیقی کے پرُستار سبھی ہال میں حاضر تھے ۔ریاستی کائینہ کے سبھی وزراء پروگرام دیکھنے اور سننے کے لئے تشریف لائے تھے ۔اسمبلی کے اسپیکر اور کونسل کے چیئرمین،انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران جموں یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ورون ساہنی اور ڈاکٹر سُدھیر سنگھ بلوریا،دوردرشن کے ڈائریکٹر شبیر مجاہد پروگرام سے لطف اندوز ہونے کے لئے تشریف فرما تھے۔شبیر مجاہد اور اُن کے نائب ڈاکٹر سوہن لال کول نے پروگرام کو فلم بند کرنے کے لئے کیمرے لگائے تھے۔جبکہ ریڈیو کشمیر جموں نے پروگرام کی ریکارڈنگ کا پورا بندوبست کیا تھا۔اس کے علاوہ نجی ٹیلی ویژن چینل والوں نے بھی اپنے اپنے کیمرے لگائے تھے تاکہ دو دِنوں پر مشتمل جشن فیض کی کاروائی کی ویڈیو گرافی کی جا سکے۔تعریفی کلمات کے بعد اُستاد حامد علی خان صاحب نے گانا شروع کیا۔سازندے سبھی مقامی تھے۔صرف خان صاحب کے ماموں جاوید فیض ڈھولک پر اُن کے ساتھ سنگت کر رہے تھے۔استاد حامد علی نے فیض کی غزلیں سنائیں۔پنجابی اور ڈوگری گیت گائے اور آخر میں اپنے بیٹے نایاب علی خان کے ساتھ مِل کر کلاسیکی جُگل بندی سُنائی اِس کلاسیکی بندش میں نایاب علی نے اپنی آواز اور مہارت کا وہ جادو جگایا کہ سارا ہال تقریباً تین منٹ تک تالیاں بجاتا رہا۔اُستاد حامد علی نے لوگوں کی فرمائش پر اپنے بڑے بھائی اُستاد امانت علی کی گائی ہوئی دو غزلیں بھی سنائیں۔نیشنل کانفرس کے صوبائی صدر دیویندر

رانا کی فرمائش پر اُنہوں نے انشا جی چلو اب کوچ کرو'' سنائی۔ اُن کے بعد رچا جین نے فیض کی دوغزلوں پر کتھک ڈانس پیش کیا اور جا گیر سنگھ نے فیض صاحب کی پنجابی نظم ''ربّا میریا'' گا کے سنائی۔ رات نو بجے وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کی سرکاری رہائش گاہ واقع وزارت روڈ جموں میں مہمانوں کیلئے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں مشہور مقامی اردو شاعر جناب فاروق نازکی نے پاکستانی شاعر انور مسعود صاحب سے کہا کہ ان کے وزیر اعلیٰ ایک آدھ مہینے سے غمگین ہیں (بیوی سے طلاق ہوگئی تھی) اس لئے اُنھیں ہنسانے کے لئے اپنا کوئی مزاحیہ کلام سنائیں۔ انور مسعود صاحب کے کلام سے سبھی محظوظ ہوئے۔ عمر اللہ صاحب تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ پھر ایوب خاور صاحب نے اپنی مشہور زمانہ غزل ''سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام'' سنائی۔ جب انہوں نے غزل کا یہ شعر پڑھا:

تیرے بِنا جو عمر بتائی بت گئی اب اِس عمر کا باقی حِصہ تیرے نام

تو انور مسعود نے پنجابی میں جُگت کی ''رہیند کھُوند'' یعنی بچا کھُچا حِصہ، تو محفل پھر زعفران زار بن گئی۔ کشور ناہید اور دوسرے پاکستانی شعراء اور ندا فاضلی نے بھی اپنا ایک آدھ شعر سُنایا۔ یوں مشہور وازہ (خانساماں) حاجی غلام محمد المعروف ممہ وازہ کے بنائے ہوئے واز وان کے ساتھ یہ محفل برخاست ہوئی۔ دوسرے دِن کا آغاز فیض احمد فیض کی بیٹی محترمہ سلیمہ ہاشمی کے مضمون سے شروع ہوا۔ اس خوبصورت پیپر میں سلیمہ ہاشمی صاحبہ نے اپنے والد کا سیالکوٹ سے ٹانگے میں جموں آنا اور وہ بھی صرف اپنی محبوبہ ایلیس سے ملنے کے لئے، اُن کی شادی کا احوال۔ پاکستان میں جنرل ایوب خان اور پھر جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں باغیانہ نظمیں لکھنے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، خاص کر منٹگمری (ساہیوال) جیل کی روداد، بیٹیوں سے محبت اور بین الاقوامی سطح پر اُن کی عزت افزائی کا ذِکر تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ محترمہ سلیمہ ہاشمی پیپر نہیں پڑھ رہیں بلکہ اپنے والد سے باتیں کر رہی ہیں۔ مشاعرہ شام 5 بجے شروع ہوا جس کی نظامت انور جلال آبادی نے کی۔ سب سے پہلے ملکی شعراء کو دعوت سُخن دی گئی۔ چنانچہ وسیم بریلوی، فیاض فاروقی، نواز دیوبندی، اشوک ساحل، سردار پنچھی، انور جلال آبادی اور ندا فاضلی صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ گلزار صاحب اور جاوید اختر اپنی فلمی مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکے۔ مشاعرے کے دوسرے حصے میں پاکستانی شعراء نے اپنا کلام سنایا جبکہ نظامت کے فرائض اعزاز احمد آذر مرحوم نے ادا کئے۔ مشاعرے کی صدارت جناب انور مسعود صاحب نے کی۔ جن پاکستانی شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ تھے، ایوب خاور اعزاز احمد آذر، منظر نقوی، علی اکبر ناطق، عشرت آفرین اور کشور ناہید، آخر میں انور مسعود نے اُردو

اور پنجابی کی سنجیدہ شاعری سنانے کے بعد اپنا مزاحیہ کلام دونوں زبانوں میں سنایا۔اور پھر فرمائش شروع ہوئی۔ایوب خاور اور کشور ناہید نے دوبارہ اپنا کلام سُنایا اور انور مسعود صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق مزاحیہ نظمیں ''بنیان''، ''کیہ پکایئے'' وغیر سنائیں۔رات کو قانون ساز کونسل کے چیئر مین شری امرت ملہوترا کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔وہاں فرمائش پر اُستاد حامد علی خان اور نایاب علی نے اپنی من پسند غزلیں اور کلاسیکی رنگ پیش کیا۔سابقہ ایڈوکیٹ جنرل اور خالد حسین صاحب کے دوست اسلم گونی صاحب نے پاکستانی مہمانوں کو اگلی شام کھانے کی دعوت پر بُلایا۔جبکہ خالد حسین نے بٹھنڈی میں اپنے گھر سب کو ناشتے پر آنے کی دعوت دی۔اسلم گونی صاحب نے بھی واز وان سے مہمانوں کی تواضع کی اور وہاں بھی سنگیت اور شعروشاعری کی محفل جمی۔چوتھے دِن پاکستانی مہمانوں کے قافلے کو میں یعنی لیاقت جعفری اور خالد حسین لیکر امرتسر کے لئے روانہ ہوئے۔ہمارے ساتھ جموں وکشمیر کیڈر کے آئی،پی،ایس افسر اور انگریزی شاعر بسنت رتھ بھی واہگہ بارڈر تک مہمانوں کو چھوڑنے کیلئے آئے تھے۔رات ہم نے امرتسر میں گذاری اور اگلی صبح یعنی 15 دسمبر 2011 کو ہم نے پاکستانی مہمانوں کو واہگہ بارڈر پر الوداع کہا اور واپس جموں آ گئے۔''جشن فیض احمد فیضؔ'' کا دوروزہ پروگرام نہایت کامیاب اور یادگاری رہا۔جس کی چرچا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے کئی دِنوں تک جاری رکھی۔پاکستانی اور ہندوستانی شاعروں کے انٹرویو چھپتے رہے۔جموں،سرینگر،لکھنؤ،حیدرآباد اور کئی دیگر دوردرشن اسٹیشنوں سے پورے پروگرام کو دکھایا گیا۔خالد حسین پورے پروگرام میں بہت زیادہ مصروف رہے۔پیسے کا حساب کتاب،مہمانوں کو مشاعرہ پڑھنے کا نذرانہ دینا۔اُستاد حامد علی خان کو طے شدہ رقم دینی،غرض مالی معاملات میں وہ بُری طرح اُلجھے رہے۔اسی لئے وہ پروگرام میں بیک سٹیج ہی کام کرتے رہے۔شکُر خدا کا کہ کسی مہمان نے کوئی شکایت نہیں کی۔خالد حسین نے ذاتی طور پر دیپک شرما (ڈرامہ ڈائریکٹر اروڈ پٹی ڈائریکر فلوری کلچر) کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کئی دِن کی محنت سے اسٹیج تیار کیا۔جناب سہیل کاظمی کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنے دفتر میں بیٹھنے اور کام کرنے کی سہولیت بہم پہنچائی اور چائے پانی کا بھی خیال رکھا۔جناب روندر کول کا جو خالد حسین کی ذاتی گذارش پر ممبئی سے پروگرام کو کنڈیکٹ کرنے کے لئے آئے تھے۔اس یادگاری پروگرام کی کامیابی کا سہرا خالد حسین اور محمد اسلم قریشی،سہیل کاظمی،مجھ ناچیز اور ''جموں سول سوسائٹی برائے فن اور ادب'' کے سبھی ساتھیوں کو جاتا ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا (مجروح سلطان پوری)

بے لباس آئینے

چلتے پھرتے ہوئے مہتاب دیکھا ئیں گے تمہیں
ہم سے ملنا کبھی پنجاب دیکھا ئیں گے تمہیں (راحتؔ اندوری)

جموں وکشمیر میں پنجابی ادبی انجمنیں، مادری زبان اورادب کے لئے اُتنا کام نہیں کر رہی تھیں، جتنا اُنہیں کرنا چاہئے تھا۔ کشمیر میں دہشت گردی پھیلنے سے پہلے یعنی 1990ء تک پنجابی ساہت سبھا سرینگر، تواتر سے ادبی سرگرمیاں کرتی رہتی تھی۔ ہر ہفتے سبھا کی میٹنگ ہوتی۔ جس میں ادیب اورشاعر اپنی تخلیقات تنقید کے لئے پیش کرتے۔ بھرپور بحث ہوتی اورتخلیق کاروں کو اپنی خوبیوں اورخامیوں کا پتہ چلتا اور وہ اپنے فن پارے کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کرتے۔ پنجابی ساہت سبھا کی میٹنگوں میں بڑی خوبصورت کہانیاں پڑھی جاتیں۔ افسانوں کے علاوہ شاعری اوردیگرنثری چیزیں پڑھی جاتیں۔ جہاں ناول، ناولٹ، افسانے، ڈرامے اوردیگراصناف پر قلمکاروں کی کاوشوں کی سراہا جاتا۔ وہیں شاعری فنی معیار پر پوری نہیں اترتی تھی، جس کی بنیادی وجہ عروض اورچھندوں سے ناواقفیت ہوتی۔ لہٰذا عامطور پر تُک بندی کی جاتی۔ پنجابی کے 90 فیصد شاعر بے وزن شعر کہتے بلکہ لکھتے ہیں۔ 1990ء سے پہلے جتنی بھی ادبی میٹنگیں ہوتیں، ان میں پنجابی کے علاوہ اردو، ہندی، ڈوگری، کشمیری اور پہاڑی کے ادیب بھی شرکت کرتے اوراپنی نگارشات پڑھتے۔ موسم گرما میں اکثر ہندوستان کے مختلف صوبوں سے پنجابی، ہندی اوراُردو کے ادیب اوردانشور کشمیر آتے تو پنجابی ساہت سبھا والے اُنھیں اپنے پروگراموں میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے۔ سنت سنگھ سیکھوں، کرتار سنگھ دُگل، ہربھجن سنگھ، عطر سنگھ، کلونت سنگھ وِرک، سوہن سنگھ، ستیل، کپور سنگھ گھمن، اجیت کور، دلیپ کورٹوانہ، مہیپ سنگھ، پریتم سنگھ، جگجیت سنگھ آنند، سادھوسنگھ ہمدرد، پریم پرکاش، ہربھجن باجوہ، (پنجابی ادیب ودانشور) علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، مظہر امام، قیصر قلندر، رتن سنگھ (اردو) وغیرہ نامور ادیبوں اورشاعروں نے سبھا کے صدردفتر واقع کُکڑ بازار (مائسمہ) کورونق بخشی۔ سبھا اپنا ماہنامہ ''ھیمال'' بھی نکالتی تھی کل ہند پنجابی ادبی کانفرنس 7۔8 جولائی 1975) کوکون بھلا سکتا ہے۔

لیکن 1990ء کے بعد کشمیر میں حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ پنجابی ساہت سبھا کا

دفتر بند ہوگیا اور مقامی پنجابی ادیبوں کو گورودوارے میں پناہ لینا پڑی۔ کرفیو، کریک ڈاؤن، بم بلاسٹ، گولی باری اور کراس فائرنگ کی وجہ سے ادیب، شاعر اور دانشور کئی کئی مہینے مِل نہیں پاتے تھے۔ ادبی میٹنگیں تقریباً ختم ہوگئیں۔ ادیب گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ خالد حسین بھی پنجابی ساہت سبھا سری نگر کا حاصل تھا۔ اُس نے 1971ء سے سبھا کی میٹنگوں میں جانا شروع کیا اور اُسے ہربھجن سنگھ سا گر وہاں لیکر گیا تھا جس کی ایما پر خالد حسین نے پنجابی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ 1981 تک لگاتار پنجابی ساہت سبھا کا حصہ رہا اور 1975ء کی کُل ہند پنجابی ادبی کانفرنس کے بعد وہ سبھا کی پہچان بن گیا۔ اُس کے دو پنجابی افسانوی مجموعے ''تے جہلم وگدا رہیا'' اور ''گوری فصل دے سوداگر'' اُن ہی کہانیوں پر مشتمل ہیں جو اُس نے سبھا کی میٹنگوں میں پڑھی تھیں۔ دربار مُوجب جموں ہوتا تو وہ پنجابی لیکھک سبھا جموں، ساہت سبھا رنبیر سنگھ پورہ اور بزم فروغِ اُردو کی ادبی نشستوں میں جایا کرتا۔ جموں وکشمیر میں تقریباً تیس پینتیس پنجابی ادیب اور شاعر ہوں گے۔ نئے لکھنے والے اِکا دُکا ہی نظر آتے ہیں، لیکن پونچھ کے ایک نوجوان شاعر جو پچھلے 25 سال سے جموں میں رہتا ہے، اُس نے پنجابی شاعری کے حوالے سے اپنا منفرد مقام بنایا ہے اور نہ فقط ہندوستان اور پاکستان بلکہ پوری دُنیا میں بسنے والے پنجابیوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اُس کا نام سوامی انتر نیرو ہے اور وہ پنجابی کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان اور پنجابی کی ایک ذیلی بولی پوٹھواری یا پہاڑی میں بھی بڑا خوبصورت کلام کہتا ہے۔ اسی طرح پونچھ کا ہی ایک اور ہیرا لیاقت جعفری ہے جو آج بین الاقوامی سطح پر اُردو پڑھنے، لکھنے اور سُننے والوں میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگوں اور خاص کر دانشوروں کو اُس کے کئی اشعار ازبر ہیں اور عام بات چیت میں اُس کے اشعار دہرائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھی پوٹھواری یا پہاڑی میں شعر کہتا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر کمل دیپ سنگھ، ہرجیت سنگھ دیپ، ڈاکٹر رندھیر کور جیسے نئے لکھنے والے اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر مونو جیت، سرُ یندر نیر اور بلجیت سنگھ رینہ تواتر سے لکھ رہے ہیں اور پنجابی ادبی دُنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک آدھ پرانے ادیب بچے ہوئے ہیں جو شاید اب لکھتے تو نہیں لیکن تقریبات کی صدارت ضرور فرماتے ہیں ورنہ ریاست میں پنجابی کے نام پر اب ہاشم دین کا پنکھا ہی رہگیا ہے۔ جموں یونیورسٹی میں پنجابی شعبہ پچھلے 46 سالوں سے کام کر رہا ہے لیکن ڈاکٹر دیویندر سنگھ کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس شعبہ میں بھی کوئی ادبی سرگرمی نہیں ہو رہی۔ نہ کبھی سیمینار اور نہ ہی طالب علموں کو یونیورسٹی میں آنے والے مہمان ادیب، شاعر یا محقق سے ملایا جاتا ہے یا اُن کا کوئی توصیفی

لیکچر کرایا جاتا ہے تا کہ طالب علموں کا رجحان پنجابی زبان وادب کی طرف بڑھے۔الغرض سارا پنجابی شعبہ جمود کا شکار ہے۔یہی حال ادبی انجمنوں کا ہے۔دوردرشن اور آکاش وانی سے بھی پنجابی پروگرام کم وبیش ختم کر دیئے گئے ہیں۔اس صورتِ حال سے خالد حسین بہت دُکھی تھا۔ایک دِن وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کیوں نہ ایک فعال ادبی تنظیم بنائی جائے اور جموں وکشمیر میں پنجابی میں لکھنے والوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات پر سمینار کرائے جائیں۔ملک بھر سے نامور، نقاد، دانشور اور محققین کو بُلایا جائے اور مقامی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر پیپر پڑھائے جائیں تا کہ ہمیں اپنی خامیوں کا پتہ چل سکے اور ان کے مشوروں سے اپنی تحریروں میں بہتری لائی جاسکے اور ہم سب کو پتہ چلے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم چار ادیب اکٹھا بیٹھے اور یوں ''پنجابی ادبی سنگت'' کا جنم ہوا جس میں خالد، ہربھجن سنگھ ساگر، سرن سنگھ اور میں یعنی ڈاکٹر سوشیل شرما تھے۔نہ کوئی صدر، نہ جنرل سیکرٹری اور نہ کوئی عہدے دار۔اس چوکڑی نے پہلا سمینار ہربھجن سنگھ ساگر کی کہانیوں پر کروایا۔اُس کی کتابیں مضمون نگاروں کو بھیجی گئیں۔پنجاب، ہریانہ اور دہلی سے پنجابی الوچک پرچے پڑھنے آئے۔اسی طرح کنول کشمیری، پروفیسر پریم سنگھ، سرن سنگھ، بلجیت رینہ، گورچرن سنگھ گلشن اور سریندر نیر کی تخلیقات پر الگ الگ سمینار کرائے گئے۔ان میں ملک بھر کے پنجابی سکالروں نے حصہ لیا۔ان تمام پڑھے گئے مضامین کو ریاستی کلچرا کادمی کے پنجابی جریدے ''شیرازہ پنجابی'' میں قسط وار چھپوایا گیا۔اسکے علاوہ پنجاب سے چھپنے والی کئی پنجابی میگزینوں میں بھی یہ پیپر چھپے۔جن کی وجہ سے ریاست کے ادیبوں کی بیرون ریاست پہچان بنی۔ پنجابی ادبی سنگت کی طرف سے ایک تحقیقی جریدہ لوک وانی جاری کیا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے یہ بند کرنا پڑا گیا۔ریاستی کلچرا کادمی نے خالد حسین کے افسانوی سفر پر تین روزہ سمینار جموں کے کندن لال سہگل ہال میں کرایا۔جس میں ملک بھر سے نامی گرامی دانشور اور تنقید نگاروں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر دیپک منموہن سنگھ (چندی گڈھ) ڈاکٹر ستیندر سنگھ نور (نائب صدر ساہتہ اکادمی نئی دہلی) ڈاکٹر روندر کمار (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر رویل سنگھ (سیکرٹری پنجابی اکادمی اور نقاد، نئی دہلی)، ڈاکٹر سرُ جیت (صدر شعبہ پنجابی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) ڈاکٹر جوگندر سنگھ راہیؔ (سابقہ صدر شعبہ پنجابی گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر)، ڈاکٹر رمیندر کور (صدر شعبہ پنجابی، گورونانک دیو یونیورسٹی)، ڈاکٹر ہر جیت سنگھ، ڈاکٹر سکھدیو (صدر شبعہ پنجابی، پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ)، ڈاکٹر دیویندر کور (امرتسر)، ڈاکٹر برجندر نسرالی، ڈاکٹر صنوبر، ڈاکٹر انورادھا، ڈاکٹر کمل دیپ، ڈاکٹر رندھیر، ڈاکٹر پرمندر سنگھ (

سابقہ ہیڈ آف انگلش ڈیپارٹمنٹ گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر، جاوید قدوس (سابقہ ہیڈ اُردو شعبہ کشمیر یونیورسٹی جنہوں نے خالد حسین کی اردو کہانیوں کے بارے میں مفصل پرچہ پڑھا) ان سب دانشوروں نے خالد حسین کی کہانیوں کے موضوعات، پیش کاری، فنی چابک دستی، شاعرانہ زبان کا استعمال، محاوروں اور علامتوں کے بارے میں پرچے پڑھے۔ ان کے اسلوب پر بات کی گئی۔ مضامین میں ایس ایسی پرتیں کھولی گئیں، جن سے شاید افسانہ نگار بھی ناواقف ہو۔ سمینار کے تیسرے دِن کی کاروائی ضلع ادھم پور کی تحصیل لاٹی کے صحت افزا مقام دُھونہ میں خالد حسین کے سسرال گھر میں ہوئی جو جموں سے 150 کلومیٹر دور ہے دُھونہ چنہنی سُدھ مہادیو اور وہاں سے مان تلائی (جہاں دھریندر برہمچاری نے آشرم بنایا تھا) آشرم سے 25 کلومیٹر آگے پڑتا ہے۔ یہ علاقہ گلمرگ اور یوس مرگ سے کسی بھی طور کم خوبصورت نہیں ہے۔ یہاں دیوداروں کے جھُرمٹ میں ادبی محفل سجائی گئی اور باقی کے پرچے پڑھے گئے۔ ان تمام مضامین کو یکجا کر کے میں نے کتاب تیار کی اور ''خالد حسین دا کتھا جگت، کے عنوان سے چھپوائی جو ریسرچ سکالروں کے لئے ایک ریفرنس بُک بن چکی ہے۔ ریاستی کلچرا کادمی نے بھی یہ مضامین لڑی وار پنجابی شیرازہ میں شائع کئے تھے۔ پنجابی ادبی سنگت'' نے پاکستان کے مشہور پنجابی ناول نگار اور شاعر فخر زمان صاحب کو جموں بُلا کر اُن کے ساتھ ایک پروگرام کروایا۔ جس کی صدارت جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایتا بھ مٹو نے کی اور کشمیر ٹائمز کے مدیر جناب وید بھسین مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ پروگرام جموں یونیورسٹی کے چھوٹے ہال میں منعقد ہوا۔ خالد حسین کی سرپرستی میں ادبی سنگت نے کئی کتابیں چھاپیں۔ جموں کشمیر کے فنکاروں، صحافیوں، شاعروں، افسانہ نگاروں کے انٹرویو کئے جو جالندھر سے چھپنے والے پنجابی روزنامہ ''نواں زمانہ'' میں چھپے۔ جن لوگوں کے انٹرویو میں نے کئے اُن میں کشمیری زبان کے معتبر شاعر اور بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ اور ساہتہ اکادمی انعام یافتہ جناب رحمان راہیؔ، انگریزی روزنامہ ''کشمیر ٹائمز'' کے چیف ایڈیٹر جناب وید بھسین، سردار پرتپال سنگھ بیتابؔ، نرسنگھ داس دیو جموال (ڈوگرہ ادیب) ہربھجن سنگھ ساگر، کنول کشمیری، سرن سنگھ اور خالد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ خالد حسین کا انٹرویو شاہ مکھی (اردو رسم الخط) میں ڈاکٹر پروفیسر عاشق رحیل نے روزنامہ ''خبراں'' لاہور میں شائع کیا۔ یہ سبھی انٹرویو بعد ازاں میں نے ''ساہت سنواد'' کے نام سے کتابی صورت میں چھاپے۔ ان انٹرویوں کی وجہ سے ریاست کے کشمیری، ڈوگری، اردو اور پنجابی ادیبوں کی جان پہنچا ن پنجابی دنیا سے ہوئی۔ پنجابی ادبی سنگت نے جموں میں دو بار پنجابی لوک گیتوں کا رنگا رنگ پروگرام

بھی کرایا۔ جبکہ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور نارتھ زون کلچر سنٹر پٹیالہ کی شراکت سے ایک بہت بڑا ثقافتی پروگرام جموں میں کرایا۔ ساہت اکادمی نئی دہلی کی مالی مدد سے پنجابی سمینار سرینگر میں کرایا۔ جس میں کشمیر کے اردو اور کشمیری ادیبوں نے بھی شرکت فرمائی۔ جن میں جناب فاروق نازکی، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، خالد بشیر احمد، رُخسانہ جبیں عزیز حاجنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پنجابی ادبی سنگت کے پروگرام دراصل گھر پھونک تماشہ دیکھنے والی بات رہی کیونکہ مالی بوجھ کوئی بھی بانٹنے کو تیار نہ تھا۔ دھیرے دھیرے ''پنجابی ادبی سنگت'' بھی کاغذوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ مجالس کے لئے 80 فیصد خرچہ خالد حسین کو برداشت کرنا پڑتا۔ جس سے وہ دِل برداشتہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی پنجابی زبان اور ادب کی ترقی کے لئے اُس کا جنون کبھی کم نہ ہوا۔ اس بات کا ثبوت ڈاکٹر اروندر سنگھ امن ایڈیشنل سیکرٹری کلچر اکادمی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مجھے سنایا کہ جب مردم شماری کے اہلکار نے خالد حسین کو اُن کی مادری زبان کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ''پنجابی'' جب اُس نے پوچھا کہ دوسری زبان کون سی ہے تو جواب مِلا کہ ''پنجابی'' جب اُس نے پوچھا کہ تیسری زبان کون سی ہے تو جواب ملا کہ اُردو ہے۔ خالد حسین کے فن اور شخصیت کے بارے میں ریاستی کلچرا کادمی نے ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا۔ اسی طرح بدایوں سے نکلنے والے ماہنامے ''لمحے لمحے'' کا بھی ایک خصوصی شمارہ اُن کے اردو افسانوں کے حوالے سے شائع ہوا۔ جبکہ ''تحریک ادب وارانسی اور ''نگینہ'' سرینگر کے خصوصی گوشے بھی ان کے اردو ادب اور فن کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔ آج وہ ہم سے بچھڑ چکے ہیں جس کا ہم سب کو دُکھ ہے، افسوس ہے۔ ہم دعا گو نہیں کہ وہ وہاں بھی اپنے ادبی حلقہ احباب میں رہیں اور پرسکون رہیں ؎

مجھ کو کبھی غُرور سے نسبت نہیں رہی
یہ سانپ آستیں میں پلنے نہیں دیا

☆☆☆

افسانے Afsane

Do rangon ki kahani by Noor Shah (Srinagar)cell-9906771363

نورشاہ (سرینگر)

دو رنگوں کی کہانی

اور جب بے آواز قدموں سے وینا پٹواری سٹی کلب کے سجے سنورے کمرے کے اندر آئی تو فوراً اس کے ذہن میں دیر سے آنے کا احساس جاگا کیونکہ کمرہ خالی ہو چکا تھا صرف پروین خان اکیلی تنہا صوفہ پر اپنی ٹانگیں دراز کئے کسی انگریزی میگزین میں شائع نیم عریاں تصویریں دیکھنے میں مصروف تھی۔ ذرا سی آہٹ پر اُس نے اپنی پلکوں کو جنبش دی اور دروازے کی جانب دیکھا۔ لمبے لمبے بالوں والی وینا پٹواری کو دیکھ کر لگا جیسے شعلوں سے جوانی عود کر آئی ہو جیسے کمرے کی خاموش فضائیں رقص کرنے لگی ہوں جیسے کہیں کسی پہاڑ کی اُوٹ سے زوردار بادل آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے آئے ہوں۔

''دیر کر دی آتے آتے''

''ہاں مجھے آتے ہی احساس ہو گیا۔ سب چلے گئے کیا؟''

''ہاں لیکن اچھا ہوا کہ تمہارے آنے سے پہلے ہی محفل برخاست ہو گئی۔ ورنہ وینا پٹواری.....''

''ورنہ کیا'' وینا پٹواری نے پروین خان کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ورنہ جانے کس کس کے ہوش اُڑ اجاتے..... وینا تم بہت سندر لگ رہی ہو اس میچنگ ڈریس میں سر سے پاؤں تک ایک رنگ، ایک روپ، ایک انداز''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے پروین خان۔ تم نے اپنی نگاہوں میں ایک اپنی دنیا بسالی ہے اور تمہاری یہ دنیا بڑی خوبصورت ہے۔ اس لئے تمہاری نظریں تمہاری نگاہیں ہمیشہ خوبصورتی کی تلاش میں رہتی ہیں..... اچھا یہ بتاؤ؟

''کیا''

''کیسا رہا آج کا پروگرام۔ خوب محفل جمی ہوگی''

''بس وہی معمول کی باتیں تاش کے باون پتے کوئی جیتا کوئی ہارا..... چائے..... گپ

شپ!''

''گپ شپ..... آج گپ شپ کا موضوع کیا تھا۔''

''گپ شپ کا کوئی موضوع ہوتا ہے کیا۔ وہی نئی پرانی باتیں۔ کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی..... لیکن تم..... یہ سج دھج..... کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا؟''

''ہاں اسی لئے تو یہاں آنے میں دیر ہوئی۔ آج ایک ماہ اور چھ دن کے بعد وہ آرہے ہیں۔''

''کون''

''میرے پتی دیو اور کون..... وہ ریلوے میں کام کرتے ہیں۔ بڑی مشکل سے فرصت ملی ہے اُنہیں۔ آج اُن کی ٹرین ٹھیک آٹھ بجے ساتھ والے اسٹیشن پر رُکے گی اور میں اُن سے ملنے ریلوے سٹیشن جارہی ہوں۔ پھر..... اب کیا کہوں!''

''Very Interesting'' امسز وینا پٹواری''

''پھر ہم دونوں گھر گرہستی اور دنیاوی پریشانیوں سے دور ساری رات کسی ہوٹل میں گزاریں گے۔''

''ہوٹل..... ہوٹل کیوں؟'' پروین خان نے جاننا چاہا

''نہیں سمجھی''

''نہیں تو''

''موج مستی کے لئے'' وینا پٹواری نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''موج مستی..... Oh my God سمجھی..... ایک بات پوچھوں''

''ہاں ضرور''

سبز رنگ کے لباس میں تم کس قدر خوبصورت لگتی ہو شاید تمہیں اس بات کا احساس نہیں..... شاداب..... سرسبز..... تمہیں اس روپ میں دیکھ کر اُن کے تو ہوش اُڑ جائیں گے۔''

''پروین تم نہیں جانتی۔ میرے اس پہناوے میں ایک راز پوشیدہ ہے اور اس راز کو ہم دونوں کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔''

''راز کو جب سب جاننے لگیں گے تو راز.....

''راز نہیں رہتا یہی کہنا چاہتی ہو نا بیگم پروین خان''

''ہاں''

تم چاہو تو تمہیں اس راز سے آشنا کرسکتی ہوں۔'' وینا پٹواری نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا''

''مجھے بہت خوشی ہوگی تمہارے اس اعتماد پر۔اعتبار پر''

''تو سنو۔انہیں دو ہی رنگ پسند ہیں سرخ اور سبز۔اس کی اپنی ایک وجہ ہے ایک خاص اور اہم وجہ ہے ۔دراصل ریلوے میں کام کرتے کرتے اُن کی نظروں میں دو ہی رنگ جھلملاتے رہتے ہیں۔سرخ رنگ اور سبز رنگ یہ دونوں ریلوے رنگ بھی کہلاتے ہیں۔سرخ جو خطرے کا رنگ ہے، حادثوں کا رنگ ہے مسافروں کو خطرہ انسانی زندگی کو خطرہ ریلوے اثاثوں کو خطرہ اور دوسرا سبز رنگ..... سکون شانتی اور محبت کا رنگ''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو''

''سنو تو سہی انسان اکثر زندگی کی یکسانیت سے گھبرا کر تفریح کے مختلف زاویے تلاش کرتا ہے۔اُن کے آنے پر یا تو میں سرخ رنگ کا لباس زیب تن کرتی ہوں یا سبز رنگ کے لباس میں اپنے آپ کو چھپا دیتی ہوں۔''

''یہ تو رنگوں کی کہانی ہے۔نہ سمجھنے والی کہانی ہے بڑی دلچسپ، آخر کیا راز پوشیدہ ہے رنگوں کی اس کہانی میں''، بیگم پروین خان نے مسز وینا پٹواری سے جاننا چاہا۔

''اب میں اس راز سے پردہ اٹھا رہی ہوں۔جب وہ ٹرین سے اترتے ہیں تو اکیلے نہیں ہوتے اُن کے دوسرے ساتھی بھی اُن کے ساتھ ہوتے ہیں پھر وہ سب ریلوے کنٹین کا رُخ کرتے ہیں چائے کافی پیتے ہوئے ان کی گفتگو طوالت اختیار کر جاتی ہے۔اس لیے اُن سب کی موجودگی میں اُن سے کھل کر بات نہیں ہوتی ہے ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔

''لیکن..... لیکن.....!''

''لیکن کیا''

''مجھے سرخ لباس میں دیکھ کر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ موج مستی کی کوئی گنجائش نہیں۔موج مستی کے راستے بند ہیں۔''

دفعتاً پروین خان نے وینا پٹواری کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں پوچھا..... ''اور سبز رنگ؟''

وینا پٹواری نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا..... ''اس مطلب یہ ہے کہ گزرے ہوئے شب و روز کی گم شدہ سرشاری سے اپنے اَن دیکھے خوابوں کو سجانے کے لیے راستہ صاف ہے۔''

☆☆☆

Aansoo Kyon ? by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

آنسو کیوں ۔ ۔ ؟

سورج میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک احساس ہے۔اس احساس کی قدر تب ہوتی ہے جب آپ کے ارد گرد ایسی چیزیں رونما ہوتی ہیں جن کی آپ اَن دیکھی کرتے ہیں۔ جب آپ پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے، احساس صرف آپ کا ہے۔

وہ چھوٹا بچہ جو اسکول جانے کی تیاری کرتا ہے۔ اُس کی ماں اُس کے خوبصورت بالوں کو بڑے پیار اور دُلار سے کنگھی کر کے اُنہیں ترتیب سے رکھتی ہے۔ وہ بچہ گھر کی دہلیز پار کر کے اپنے محلے کے کوچے میں ان ترتیب شدہ خوبصورت بالوں کو بگاڑتا ہے۔اب یہ بے ترتیب بال اُس کے ماتھے پر ایسے بکھر جاتے ہیں کہ سورج اُس سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سورج اُس بہت دور چلا گیا ہے۔

پھر جب وہ کچی عمر پار کر کے بالغ ہو جاتا ہے، تب بھی وہ شرمیلا ہی رہتا ہے۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا چلا گیا، اُس کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جنہیں یاد کر کے اُسے اُداسی گھیر لیتی تھی۔ اُسے اب بھی یاد ہے ۔ ۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا، عموماً اندھیری راتوں میں اپنے محلے کی چھوٹی اور تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے کشادہ سڑکوں پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ اُن کالی راتوں میں اکیلے میلوں چلتا تھا اور خود کو تلاش کرتا تھا۔ وہ خود کو حساس ہونے کی سزا دیتا تھا اور یوں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا لیکن ہر بار گھر والوں کی تلاش کامیاب ہوتی تھی اور وہ گھر کے کمرے میں قید ہو کر رہ جاتا تھا۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ خود کے قریب ہو گیا اور دوسروں سے دور چلا گیا، کیونکہ وہ تنہا ہو گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر ایک ایسی دنیا کی تلاش میں نکلا کہ شاید وہ دنیا خوبصورت ہو گی ۔لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ اپنی پرچھائیوں میں قید تھا۔ وہ اب ان سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ کبھی کبھار اُس کی سوچ بھی مفلوج ہو کر رہ جاتی تھی۔ ایسے لمحات میں اُس کا واحد سہارا اُس کی ماں کا پُرنور چہرہ تھا، جو اُس کے لئے زندگی کی علامت بن جاتی تھی۔ یہی وہ علامت تھی جس نے اُس کو

احساس دلایا کہ اور بھی لوگ تکلیفوں میں مبتلا ہیں اور ان تکلیفوں کو برداشت کرتے ہیں۔ یہی وہ وجہ تھی کہ اُس نے اُن تکلیفوں کو قلم کے حوالے کر دیا۔ وہ خود سے بھی لڑتا رہا اور بھاگتا رہا۔ اوروں کی تکلیفوں کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔

جب وہ یونیورسٹی پہنچا اُس کو ایک نئی دنیا ملی۔ اُس کے قلم نے ایک نیا انداز، ایک نئی رفتار پکڑی۔ یہ قلم ہی تھا جس سے کئی افراد اُس کے ساتھ جڑ گئے اور یوں وہ اپنے ہم خیالوں کے حلقے میں بندھ گیا۔ اسی حلقے میں اُس کو ایک ایسا دوست ملا جو اپنی زندگی کے آخری ایام تک اُس کے ساتھ رہا۔ اُس دوست سے اس کی جان پہچان کچھ انوکھے طریقے سے ہوئی۔ جب اُس نے اپنے اس دوست کو پہلی بار گھر بلایا تو وہاں اُس کی ماں نے، جو کہ ایک نورانی شخصیت کی مالک تھیں، پوچھا

''بیٹے! تم کون ہو ۔ ۔ ؟''

''جی میں آپ کے بیٹے کا دوست ہوں''

ماں نے دوست سے کہا :

''اچھی بات ہے۔ سن بیٹا، اگر تم میرے بیٹے کے دوست ہو تو میں چاہتی ہوں کہ تم اُس کے ایسے دوست بنو کہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہو۔ غم ہو یا خوشی، ہمیشہ اکٹھے رہنا۔ اُسے کبھی بھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ وہ زندگی میں اکیلا ہے۔ بیٹا! میرا بیٹا شرمیلا ہے، دنیاداری سے ناواقف ہے''

دوست نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا :

''ماں جی، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں زندگی بھر آپ کے بیٹے کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا''

پھر دونوں میں ایسی دوستی ہوئی جو ہمیشہ قائم رہی۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے، آپسی اُلجھنوں کو اکٹھے سلجھاتے، مشکلوں اور پریشانیوں کو حل کرتے، غرض ہر وقت ایک دوسرے کی فکر کرتے۔ آخر کار اُسے وہ راستہ ملا جس کی اُس کو تلاش تھی۔

کئی دفعہ ایسا بھی ہوا جب وہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہے لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہے۔ اس دوستی نے اُسے خود اعتمادی کے اُس راستے پر ڈال دیا، جس پر چل کر اُس نے زندگی کی ہر لڑائی ایک پُر اعتماد سپاہی کی طرح لڑی۔ وہ بچہ جو کل تک اپنے ماں کے ہاتھوں ترتیب دیے ہوئے بالوں کو بگاڑتا تھا، اُس نے اپنی ذات کا مینار کھڑا کر دیا۔ اس باوقار کامیابی پر اُس کا دوست پھولے نہ سمایا۔ وہ دونوں اپنی دشواریوں اور رُکاوٹوں پر کامیابی پانے کے

لئے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے۔ جب حالات نے اُس کے دوست کو دیوار سے لگا دیا، وہ اُس کے ساتھ کھڑا رہا۔لیکن جب اُس کا دوست بیمار ہوا، اُس کی ہمت جواب دینے لگی، کیونکہ اُسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا دوست اب اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ وہ اپنے دوست کے لئے خدا سے عجز وزاری کر رہا تھا کہ اے میرے پروردگار میرے دوست کو شفا بخش دے۔

پھر ایک رات اُس کے دوست کے بیٹے کا فون آیا :

''انکل! ۔ ۔ میرے ابو دنیا سے چلے گئے''

اُس کی آنکھوں سے رُکے ہوئے آنسو ایسے گرنے لگے جیسے گرمی کے کئی دنوں کے بعد اچانک برسات ہوتی ہے۔

اُس صبح جب دھوپ کی کرنیں پھوٹنے لگیں اُس کے سامنے اُس کا دوست کھڑا تھا۔ وہ مہبوط ہو کر رہ گیا۔ دوست نے اُس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو صاف کیا اور دھیمی آواز میں کہا :

''تم کہتے تھے کہ سورج میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک احساس ہے پھر آنسو کیوں ۔ ۔ ۔ ؟''

اُس برسات کی رات کی صبح بڑی خوبصورت تھی۔

☆☆☆

Main Kya Karoon by Dr. Nazir Mushtaq (Srinagar)
ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر) cell-9149984865, 9419004094

میں کیا کروں

میرے خوبصورت چیمبر میں میری میز کے دائیں طرف دو الماریاں رکھی ہوئی ہیں۔۔۔۔ایک پر لیبل لگا ہے۔۔۔A۔اور دوسری پر لیبل ہے B۔......A... لیبل والی الماری میں ان مریضوں کی۔فایل رکھی جاتی ہے جن کا کامیاب علاج ہوتا ہے اور لیبل Bوالی الماری میں ان مریضوں کی فایل رکھی جاتی ہے جن کا علاج کرنے میں ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔۔۔میرے ہاتھ میں ایک فایل ہے جو میں نہ چاہتے ہوئے بھی الماریB الماری میں رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ میں اس مریض کی بیماری کہ تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔۔۔مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی یا پھر مریض نے مجھ سے کچھ چھپایا۔۔۔۔جانے کیوں مجھے اس لڑکی کے ساتھ عجیب سی ہمدردی ہوگئی ہے اور اسے بھی مجھ میں ایک ہمدرد اور مسیحا نظر آنے لگا تھا۔۔۔کیا اس نے سچ کو پردے میں رکھا۔۔کتنی خوب صورت اور معصوم ہے وہ لڑکی۔۔۔بالکل آسمان سے اتری ہوئی پری۔۔۔۔۔مجھے اس سے پیار ہوگیا ہے۔مگر ایک ڈاکٹر مریض کے تئیں پیار یا نفرت کسی بھی صورت میں ظاہر نہیں کرسکتا ہے۔۔۔مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تین ماہ پہلے وہ میرے چیمبر میں داخل ہوئی تھی۔۔۔اس نے ہلکے گلابی رنگ کا فرن اور سفید رنگ کا شلوار زیب تن کیا تھا اس کے گلے میں سیاہ رنگ کا مفلر تھا اور کالی گھنیری زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔۔اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں کچھ سوالات تھے اس کے رخساروں میں گلابی چمک تھی۔ہونٹوں پر اس نے گلابی رنگ کی لپ اسٹک کا استعمال بڑی مہارت سے کیا تھا۔اس کی گردن نارمل سے زیادہ لمبی تھی۔۔۔۔۔کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے ریسپشن سے لیا ہوا کارڑ میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ڈاکٹر صاحب میں شدید ڈیپریشن میں مبتلا ہوں میری مدد کیجئے میرا مطلب ہے میرا علاج کیجیے۔اتنا کہہ کر اس نے رومال سے نتھنوں کی نمی کو صاف کیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔۔اپ کو کیسے معلوم کہ آپ شدید ڈیپریشن میں مبتلا ہیں۔۔۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔میں آج تک چار ڈاکٹروں کے پاس گیی اور سبوں نے بنا کچھ سنے میرے لییۓ سکون آور اور خواب آور گولیاں تجویز کیں۔اج کل کے ڈاکٹر مریض کا دکھڑا سنے بغیر ڈھیر

ساری دوایاں تجویز کرتے ہیں۔۔وہ صرف کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپے کمانا چاہتے ہیں۔۔میں نے دو ماہرین امراض نفسیات سے بھی مشورہ کیا مگر بے سود۔میری ایک سہیلی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ ڈیپریشن کے مریضوں کی پازیٹیوسا یکوتھراپی کرتے ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔۔۔اس نے لمبا سا جواب دیا۔۔۔۔میرا نوکر میرے لیے کافی اور بسکٹ لایا۔۔میں نے اس سے پوچھا۔آپ کافی لیں گی۔میری توقع کے برخلاف اس نے حامی بھر لی۔میں نے نوکر سے ایک اور کپ لانے کو کہا۔۔۔او کے جب تک کافی آتی ہے تب تک ہم کام کی باتیں کرتے ہیں آپ کو کیوں لگتا ہے کہ آپ شدید ڈیپریشن میں مبتلا ہیں۔اس نے ماتھے سے زلفوں کی لٹ ہٹائی اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔اس لیے کہ مجھ میں ڈیپریشن کے سارے علامات موجود ہیں۔۔مثلا۔۔۔۔کسی بھی کام میں میرا دل نہیں لگتا ہے۔نیند مجھ سے کوسوں دور بھاگ چکی ہے۔۔مجھے کوی خوشی محسوس نہیں ہوتی ہے۔۔مجھے معمولی باتوں پر غصہ آتا ہے۔۔مجھے بھوک نہیں لگتی ہے۔۔میرا وزن بڑھتا جارہا ہے میں چاہتی ہوں کہ روؤں چلاوں چیخوں۔اور اکثر خودکشی کے خیالات ذہن میں آتے ہیں مگر میں۔اتنا کہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ رومال سے ان کو پونچھنے لگی۔۔میں خاموش رہا۔۔۔نوکر کافی کا کپ لیکر آیا۔آپ کی کافی۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔اس نے شکریہ ادا کیا اور کافی کی چسکیاں لینے لگی۔۔اس نے جن علامات کا زکر کیا وہ ڈیپریشن کا تشخیص دینے کے لئے کافی تھے۔۔۔مطلب میرے سامنے بیٹھی خوب صورت لڑکی شدید ڈیپریشن میں مبتلا ہے اور اسے پازیٹیوسا یکوتھراپی کی ضرورت ہے۔۔مگر پہلے مجھے یہ پتہ لگانا ہوگا کہ اس کے ڈیپریشن میں مبتلا ہونے کی وجہ کیا ہے۔۔۔وہ سر جھکائے پتہ نہیں خیالوں کی۔کس وادی میں بھٹک رہی تھی۔۔میں اب اپنے اسسٹنٹ محمد زمان عرف جاسوس ایم زیڈ۔۔کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ یہ پتہ لگانے میں ماہر تھا کہ کس مریض کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔۔میں کل سے اسے کام پر لگاؤں گا کہ وہ اس لڑکی کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں تفصیلات حاصل کرے تاکہ میں کسی نتیجہ پر پہنچ کر اس کا علاج شروع کر سکوں۔۔میں نے لڑکی سے اس کے گھر کا پورا پتہ پوچھا اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کر رہی ہے۔۔۔۔اس نے کافی کی اخری چسکی لی اور رومال سے اپنے گلابی ہونٹ صاف کیے۔اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

او کے گلناز۔۔۔اپ اس وقت جاسکتی ہیں میی سا یکوتھراپی شروع کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کروں گا۔۔وہ تفصیلات کون حاصل کرے گا۔۔اس نے حیران

ہوکر پوچھا۔۔وہ آپ کوخود ہی پتہ چلے گا آپ اس کی فکر نہ کریں۔۔دوسرے دن میں نے جاسوس ایم زیڈ کو لڑکی کے بارے میں ساری تفصیل بتائی اور وہ اپنے مشن پر روانہ ہوا۔۔پانچ دن کے بعد وہ رپورٹ لے کے آیا۔۔۔۔گلناز یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایم اے کی اسٹوڈنٹ ہے کوئی اس کا دوست نہیں ہے وہ ایک بیحد قیمتی گاڑی میں آتی اور جاتی ہے کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔۔۔۔یہ اس کا آخری سال ہے۔۔۔۔۔۔وہ شہر کی ایک پوش کالونی میں بنی ایک عالیشان حویلی کے ایک مشترکہ کنبے میں رہتی ہے۔۔۔اس کا باپ اور چچا دونوں شہر کے مشہور ومعروف پشمینہ تاجر ہیں ان کا کاروبار کشمیر کے علاوہ دوبی مسقط عمان اسپین جرمنی اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے۔اس کا باپ سیدھا سادہ آدمی ہے اور ظاہری طور ایک عالم دین لگتا ہے۔۔اس کا بھائی یعنے گلناز کا چچا بھی ظاہری طور کوئی مذہبی رہنما لگتا ہے وہ مقامی مسجد کا صدر بھی ہے مسجد کے امام کی غیر موجودگی میں وہ امامت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے دونوں بھائی مسجد کے امور میں گہری دلچسپی لیتے ہیں اور مسجد کی تعمیر کے لیے دل کھول کر چندہ دیتے ہیں یا یوں کہیے کہ مسجد کا سارا خرچہ وہی برداشت کرتے ہیں محلے میں ہر کوی ان دونوں بھائیوں کو فرشتہ سمجھتے ہیں اور ہر کسی کے دل میں ان کے لئے احترام ہے۔۔۔گلناز کی ماں ایک الٹرا ماڈرن عورت ہے اور محلے کی غریب عورتوں کے لئے ایک این جی او چلاتی ہے۔ہر کوئی اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔۔لیکن گلناز کی چاچی ایک سیدھی سادی عورت ہے۔وہ بہت کم بولتی ہے اور بہت کم گھر سے باہر جاتی ہے۔۔نماز پنج گانہ کی عادی ہے اور کسی سے کہے بغیر محلے کی غریب عورتوں کی مدد کرتی ہے۔۔۔اس حویلی میں گلناز کا چچیرا بھائی بھی رہتا ہے مگر ان کے درمیان بہن بھائی اور دوستی کا رشتہ ہے۔علاوہ ازیں اس حویلی میں نوکر چاکر رہتے ہیں مگر سب کے سب عمر رسیدہ ہیں اور گلناز کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔۔۔گلناز کا ہمسایوں کے ہاں آنا جانا نہیں ہے وہ اپنے کمرے میں قید رہتی ہے اس کے کمرے میں دنیا کی ساری سہولیات میسر ہیں۔اس کے خاندان میں کوئی بھی فرد زہنی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا ہے۔۔۔میں نے رپورٹ دلچسپی سے پڑھ لی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ گلناز کی ڈیپریشن کی وجہ اس کی کوئی زاتی وجہ ہے۔۔ایک ہفتہ کے بعد گلناز پھر سے آی اور میں نے اس سے ڈھیر سارے سوالات پوچھے اس نے ہر سوال کا جواب صاف الفاظ میں دیا۔میں نے سایکوتھراپی شروع کی۔وہ بولتی جاتی اور میں سنتا رہتا۔جہاں کوی منفی نقطہ ابھرتا میں اسے سمجھاتا۔۔۔۔۔دو ماہ پازیٹیو سایکوتھراپی جاری رہی مگر گلناز کی ڈیپریشن کے علامات کم نہیں ہو رہے تھے اور میں بھی اپنے علاج سے مطمئن نہیں تھا۔۔بحیثیت ایک معالج کے میں سوچ رہا تھا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری

ہے۔۔۔اخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔گلناز نے مجھ سے قطع تعلق کیا اور اس کی فایل ادھوری رہی ہوا یوں کہ اس روز میں گھر سے نکلا گاڑی میں بیٹھا ڈرایور نے گاڑی استارٹ کی کہ اس کا فون بج اٹھا اس کی بیوی اسٹیٹ اسپتال میں ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ ہوی تھی اس لیے اسے جانا پڑا میں خود گاڑی چلانے لگا اسی وقت آسمان پر بادل چھائے اور کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔۔۔اگے۔کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور پھر قدم قدم پر ٹریفک جام۔۔۔۔۔مجھے کلینک پہنچنے میں دواڑھائی گھنٹے لگے۔۔گلناز کی اپوینٹمنٹ تھی وہ مجھے چیمبر میں نہ پا کر انتظار کرنے لگی مگر کب تک وہ تھک ہار کر چلی گئی اور ریسپشنسٹ سے کہہ کر گیی ءکہ ڈاکٹر بڑے لاپرواہوتے ہیں مریض انتظار کرتے ہیں اور وہ پتہ نہیں کہاں عیش کرتے ہیں۔۔۔اس طرح مریض اور ڈاکٹر کا رشتہ وقتی طور منقطع ہوگیا۔۔۔۔۔میں ہار گیا میں اس کی ڈیپریشن کے وجوہات کا پتہ لگانے میں ناکام رہا۔۔اب میں اس کی فایل تشخیص نشدہ الماری میں رکھنے جارہا ہوں۔میں نے الماری کا در کھولا اور فایل اس میں رکھنے والا ہی تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔۔۔۔۔یہ گلناز کا فون تھا۔۔۔۔۔ھیلو ڈاکٹر صاحب آپ نے کہا تھا کہ آپ جب کسی مریض کی بیماری کا صحیح تشخیص نہیں دے پاتے ہیں تو تشخیص نشدہ الماری میں رکھ دیتے ہیں۔مجھے پورا یقین ہے اپ میری فایل بھی اسی الماری میں دکھنے کی تیاری کر رہے ہوں گے مگر ڈاکٹر صاحب آپ میرے گارڈ فادر ہیں میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔۔میی آپ سے سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔۔۔اپ کے جاسوس نے ہماری فیملی کے متعلق سب کچھ بتادیا ہوگا مگر اندرونی معاملات کا وہ کیسے اندازہ لگا سکتا تھا۔۔اپ اگر برسوں تک میری سایکوتھراپی کرتے رہتے پھر بھی تشخیص نہیں دے پاتے۔سنیے میری ڈیپریشن کی وجہ ایک مرد ہے جس نے مجھے اپنی رکھیل بنا کے رکھا ہے وہ بچپن سے میرا جنسی استحصال کر رہا ہے۔۔۔جب بھی اس کا دل چاہے وہ مجھے ایک کھلونا سمجھ کر استعمال کرتا ہے مجھے ایک گدھ کی طرح نوچتا ہے جس طرح چاہے مجھے استعمال کرتا ہے۔۔اگر میں انکار کروں تو وہ میرے ماں باپ کو زندہ جلانے کی دھمکی دیتا ہے میں نے اپنی ماں سے اس بارے میں بتایا تو اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔بیٹی چپ کر آہستہ بول دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں جو ہوتا ہے ہونے دے میں کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ وہ مرد کون ہے وہ میرا چاچو ہے۔۔۔۔وہی میری ڈیپریشن کا زمہ دار ہے۔۔اب آپ ہی بتایئے کہ میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔؟؟؟؟؟

☆☆☆

Shahid Naqvi ki Marsiya Nigari by Ishteyaq Ahmad (Ph.D Scholar dept.of Urdu, Delhi University)

اشتیاق احمد (پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی)

شاہد نقوی کی مرثیہ نگاری

شاہد نقوی کا اصل نام سید شاہد حسین تھا اور شاہد تخلص، آپ کی پیدائش 31 دسمبر 1916 کو شکار پور ضلع بلند شہر اتر پردیش میں ہوئی۔ شاہد نقوی بچپن سے ہی بڑے ذہین وفطین تھے اور سن کر اشعار ازبر کر لیتے تھے۔ شاہد نقوی نے عربی اور فارسی کی تعلیم مقامی طور پر ہی حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پہلے بی اے پھر منشی فاضل اور ادیب فاضل کی ڈگریاں امتیازی حیثیت سے حاصل کیں۔ اوائل جوانی میں ہی شعر وشاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور محض تیرہ برس کی عمر میں غزل کے میدان میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔ بچپن سے ہی سیمابی طبعیت کے مالک تھے اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگے رہتے۔ غزل کے میدان میں قدم رکھا تو ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہوتا بھی کیوں نہ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے زیادہ تر شعراء اور ادباء ترقی پسندی سے متاثر ہو رہے تھے۔ ابتداء میں مختلف اساتذہ سے اپنے کلام کی اصلاح کروانے لگے۔ تاسف خورجوی، قمر جلالوی اور محشر لکھنوی شاہد نقوی کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ اسی دوران تقسیم ملک کا سانحہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان دو ملکوں میں منقسم ہو گیا بلکہ لاکھوں خاندانوں کو بھی اس عظیم سانحے کی وجہ سے متاثر ہونا پڑا۔ بہت سارے خاندان سرحد کے آر پار بٹ گئے۔ کیونکہ جب آندھی چلتی ہے تو پھر چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق جانے کہاں سے کہاں اُڑا لے جاتی ہے۔ 1947 کا تقسیم ملک کا سانحہ بھی کسی آندھی اور طوفان سے کم نہ تھا۔ شاہد نقوی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یوں نئے وجود میں آئے ملک جس کا نام پاکستان رکھا گیا تھا کی جانب ہجرت کرنی پڑی۔ دوران ہجرت شاہد نقوی کو طرح طرح کے آلام ومصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا سفر جاری رکھا۔ پاکستان میں جا کر عارضی طور پر سکونت اختیار کرنے کے بعد شاہد نقوی نے اپنا شعر وشاعری کا

مشغلہ جاری رکھا اور غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔شاہد نقوی نے 1958 میں پہلا مرثیہ کہا جس پر خوب داد وتحسین حاصل کی اور لوگوں نے بلکہ مرثیہ شناسوں نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور شاید اسی حوصلہ افزائی نے شاہدؔ نقوی کو مزید مرثیے لکھنے پر مجبور کیا۔شاہد نقوی اس دوران براہ راست دبستان کراچی سے وابستہ ہو گئے۔پاکستان میں مستقل قیام کے بعد شاہد نقوی نے اُردو مرثیے کے حوالے سے کافی شہرت حاصل کی۔

دراصل شاہدؔ نقوی نے ڈاکٹر یاور عباس سے تحریک حاصل کر کے مرثیہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور اس کے بعد پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ان کے مرثیوں کا پہلا مجموعہ "نفس مطمئن کے عنوان سے شائع ہوا محققین نے جس کا سن اشاعت 1976 لکھا ہے۔اس مجموعے میں کُل آٹھ مرثیے شامل ہیں۔سید عاشور کاظمی لکھتے ہیں کہ ان مرثیوں کے مصرع ہائے اولیٰ سے ہی شاہد نقوی کی شاعری میں ترقی پسند سوچ نمایاں ہوتی ہے۔نفس مطمئن میں شامل تمام مرثیے موضوعاتی ہیں۔جن کی تفصیلات کچھ اسطرح ہے۔

1۔ ''کربلا کے بعد'' تحریک ارتقائے مسلسل ہے کربلا	1964
2۔ ''ہلاکت وشہادت'' نقطۂ تکمیل کی جانب رواں ہے زندگی	1965
3۔''قرآن اور اہل بیت'' نقاش کن کا نقش مکمل ہے آدمی	1966
4۔'ظہور امام'' ذہنوں میں گونجتی ہے صدا انقلاب کی	1967

اس کے علاوہ شاہد نقوی نے امامت الٰہیہ، جادۂ تسلیم اور ماں کا دل جیسے موضوعات پر بھی مرثیے لکھے ہیں۔ان موضوعات کے ساتھ مصرع ہائے اولیٰ سے مرثیوں کی اٹھان اس چیز کی عکاسی کر رہی ہے کہ شاہد جدید مرثیے کی راہوں پر ثابت قدمی سے چل رہے ہیں۔بقول سید عاشور کاظمی:

''شاہدؔ نقوی جدید مرثیے کی راہوں پر گامزن ہیں نیز قدرت نے انھیں شعر گوئی سے مالا مال کیا ہے مثلاً امام غائب، حقیقت منتظر کے ظہور کو عقیدت تو نوع انسانی کی خوش بختی کا مژدہ قرار دے گی، انسان کی نجات کا سرچشمہ کہے گی مگر شاہد نقوی بشریت پر قدرت کے اس احسانِ عظیم کو انقلاب کہے رہے ہیں۔''1

شاہدؔ نقوی کے مرثیوں کا دوسرا مجموعہ 'والعصر" کے عنوان سے کراچی میں شائع ہوا جس کا سن اشاعت 1986 ہے۔اس کے علاوہ ان کا ایک اور مجموعہ کلام 'لہولہو کہکشاں" کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا۔یہ دونوں مجموعے ادبی حلقوں میں اچھی خاصی پذیرائی حاصل کر چکے

ہیں۔شاہدنقوی غزل میں اگرچہ قمرجلالوی اورمحشرلکھنوی کواپنااستاد مانتے ہیں مگر مرثیہ میں کوئی ایسا نام ظاہر نہیں ہوا جسے شاہد نقوی نے اپنا استاد کہا ہوالبتہ ان کے کلام کو پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ سید آل رضا سے بہت متاثر تھے۔سید آل رضا کے کلام کا کا رنگ شاہدنقوی کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔شاہدنقوی کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا اس لئے ان کے زیادہ تر مرثیوں کی ابتداء مرکزی خیال یا حوالہ جات آیات قرآنی کی تفسیر ہوتی ہے۔یا پھر شاہد نقوی احادیث نبوی سے روشنی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے ایک مثال تو ان کے مرثیوں کے پہلے مجموعے "نفس مطمئن" سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ان کے شروعاتی دور کے مرثیوں میں سے ایک مرثیے کا عنوان "امامت الٰہیہ " ہے جو عالموں اور دانشوروں کی تجزیہ نگاری کے مطابق قرآن کریم کی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 126 سے آگہی کے حصول کی دلیل ہے۔اس مرثیے کا آغاز حضرت اسمعیل علیہ السلام کی قربانی اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اطاعت ربانی کے واقعہ سے متعلق ہے جس میں شاہد نقوی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔نمونے کے طور پر اس مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

ہے آزمائش آج ذبیح و خلیل کی　　طے ہورہی ہے منزل تسلیم وبندگی
ہے حکم رب پسر کے گلے پر چلے چھری　　مخصوص ہوچکی ہے جزائے خلیل بھی
لو وہ چھری پسر کے گلے کی طرف چلی　　حق کی رضا ادھر سے امامت بکف چلی

اسی مرثیے میں امامت الٰہیہ میں شاہدنقوی نے امامت کے منصب کی تفصیل سے وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔اوراس کے ساتھ ساتھ امامت کے متعلق ملت کے مختلف نظریات کا تقابل بھی کیا ہے جس میں کہیں پر طنز ہے اور کہیں وضاحت ہے اور کہیں پر بیانیہ کا انداز ہے۔ایک ہی مرثیے میں مختلف جہتوں کی شاعری کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ امام وہی ہوسکتا ہے جس کی ذات سے امکان خطا نہ ہو۔مثلاً یہ بند دیکھیں:

کیا لوگ چاہتے ہیں انھیں رہنما کریں　　جو لغزشوں سے حق قیادت ادا کریں
ایک اک قدم پہ لوگوں کے منہ کو تکا کری　　ہر موڑ پر یہ ڈر ہو کہ شاید خطا کریں
ہر شخص کانپتا رہے خوف دوام سے　　خالق پناہ میں رکھے ایسے امام سے
ہونے لگے خدا کی مشیت میں بھی دخیل　　اس قول کبریا میں بھی کرتے ہو قال وقیل
پہنچے گا ظالموں کو میرا حق نہ اے خلیل　　کیا عصمت امام پہ کچھ کم ہے یہ دلیل
عصمت ہر ایک زاویے سے رد ظلم ہے　　کس کو نہیں یہ علم کہ کیا حد ظلم ہے

ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ شاہد نقوی کے اشعار تفکر سے بھرپور ہیں اور بے پناہ شاعرانہ حسن بھی رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاہد نقوی کے مرثیوں میں طنزیہ عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ طنز کی یہ مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ طنز تو صرف اور صرف نفرت کی پیداوار ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ طنز دو مخالفین کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔اور بعض اوقات دو محبت کرنے والے بھی دو مخالف ہو سکتے ہیں۔اور کبھی کبھار تو دو محبت کرنے والوں کی دوری کو مزید دور کرنے کا سبب بنتا ہے۔ضمیر اختر نقوی مذید لکھتے ہیں:

''طنز مخالفین کے درمیان ہوتا ہے۔خواہ یہ مخالفت کسی وقتی عمل کا نتیجہ ہو یا نظریات کے اختلاف کے سبب۔شاہد نقوی نے "امامت " کے متعلق غلط نظریات کی تصحیح کے لئے طنزیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔اچھا طنز ادب اور تہذیب کے پیرائے میں ہوتا ہے۔شاہد نقوی نے ان تمام نظریات کو مدنظر رکھا ہے۔''2

شاہد نقوی کی شاعری میں لفظوں کو برتنے کی بھرپور صلاحیت کا اظہار بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فکر کی وسعت بھی شامل ہے۔امام کے لئے اوصاف کاملہ کا تواتر، تکمیل آدمی کا تصور کہنا، شاہد نقوی کی وسعت فکر کی دلیل ہے۔یہ دراصل رمزیت اور اشاریت کی انتہا ہے کہ لفظوں کا الٹ پھیر صفحہ ذہن پر وہ نام لکھ دے جو شاعر لکھنا چاہتا ہے۔شاہد نقوی کے ایک مرثیے کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

جس کے عمل سے چہرہ ایماں نکھر سکے — جو دین کی رگوں میں نیا خون بھر سکے
منبر پر ادائے سلونی جو کر سکے — جس کی نگاہ کون و مکاں سے گزر سکے
جس کی زباں ملک کے لئے بھی دلیل ہو — کہہ دے جو اعتماد سے تم جرئیل ہو

دراصل اسد اریب نے شاہد نقوی کے بارے میں جو رائے دی ہے اس سے ان کے فکر و فن سے متعلق واضح اشارے ملتے ہیں۔اسد اریب شاہد نقوی کے فن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ان کے مرثیوں میں عہد نو کی اضطرابی کیفیتوں کا حال کھلتا ہے۔کہیں کہیں مضمون کی اوقیت سے وہ دبیرین اسکول کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔لیکن اظہار کے نرالے پن میں ان کی شعری صلاحیت سب سے نمایاں معلوم ہوتی ہے۔جذبے کی گہرائی، انسانی فطرت کے جدید مطالعے اور الفاظ کے تصرف میں وہ اپنے معاصر مرثیہ نگاروں کے شانہ بشانہ ہیں۔ان کے ہاں معنوی تجربوں کی وسعت نہیں۔۔۔۔حال ہی میں ان کا نو تصنیف مرثیہ 'بفتہ الرسول " شائع ہوا ہے۔میرے خیال میں یہ

مرثیہ ان کے سابقہ مرثیوں سے بہت پیچھے ہے،فکر کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کے معیار سے بھی۔''3

شاہد آقوی موضوعاتی مرثیوں کے حوالے سے ایک نمایاں نام ہے۔جدید مرثیے کے سفر میں بھی شاہد آقوی پیش پیش نظر آتے ہیں۔شاہد نقوی کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع کا بھی انتخاب کرتے ہیں اس کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔اس لئے دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ عالم،محقق اور دانشور طالب جوہری کی رائے ہے کہ شاہد نقوی کے ابتدائی مرثیوں میں جوش اور آل رضاؔ کے اثرات اس قدر گہرے پائے جاتے ہیں کہ ایک مرثیہ جوش کے اثرات کے تحت سے اور دوسرا آل رضا کے اسلوب کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہد نقوی نے ان دو بڑے شعرا کے اسالیب سے جو آمیزہ تیار کیا تھا وہی شاہد نقوی کی انفرادیت اور پہچان بن کر رہ گیا اور شاہد نقوی کو بلا خوف تردید صاحب طرز مرثیہ گو کہا جاتا ہے۔ان کے طرزِ نگارش میں نہ جوش کی تری ہے اور نہ ہی آل رضاؔ کی خشکی نظر آتی ہے بلکہ ان کے مرثیوں پر شور سمندر میں استدلال کی خشکی کے جزیرے ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔علامہ طالب جوہری نے شاہد آقوی کے مراثی ضرب مظلومیت، نالہ جرس،علی کا شیر وغیرہ کے حوالے سے شاہد نقوی کے مراثی میں مختلف جہات کی نشان دہی کی ہے۔خاص طور پر نفس مطمئن میں شامل ان کے ابتدائی مراثی کے حوالے سے ان کی طنز نگاری پر بھی بات کی ہے۔

مختصر یہ کہ شاہد آقوی نے اپنے تخلیقی کمالات کے ذریعے مرثیہ نگاری کو ایک نیا زاویہ دیا ہے۔ان کے مرثیے محض غم اور رنج کا اظہار نہیں بلکہ ایک گہرے فنی اور روحانی تجربے کا آئینہ ہیں۔ شاہد آقوی نے مرثیہ نگاری کی روایت کو اپنے منفرد انداز میں نکھارا،جس میں روحانیت،ادبیت اور تخلیقی اختراع کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ان کے مرثیوں کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں۔شاہد آقوی کے مرثیوں میں غم کی شدت، درد کی گہرائی اور اذیت کا منظر انتہائی سلیقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں کربلا کی غمگین داستان نہ صرف اس کے واقعاتی پہلو کو اجاگر کرتی ہے، بلکہ اس کی جذباتی شدت کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ قاری یا سامع ان دردناک لمحوں کو اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے۔ان کی شاعری کی اصل طاقت اس کی جذباتی گہرائی میں پوشیدہ ہے، جو دلوں کو چھو لیتی ہے اور ایک روحانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔شاہد نقوی کے مرثیے محض ایک رنجیدہ روایت کا حصہ نہیں بلکہ ادبی تخلیق کی بلند مثال ہیں۔ان کے اشعار میں لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ ہر

مصرعہ، ہر لفظ، اپنے اندر ایک فنی کشش رکھتا ہے۔ شاہد نقوی نے مرثیہ نگاری میں شعر و سخن کی تمام لطافتوں کو بروئے کار لایا، جہاں قافیہ و ردیف کے استعمال سے ایک ایسی بہاؤ پیدا ہوئی ہے جو پڑھنے والے کو اس کرب و اذیت کی گہرائی میں لے جاتی ہے۔ شاہد نقوی کے مرثیوں میں مذہبی اور روحانی پیغامات کی جھلک بہت واضح ہے۔ ان کا مرثیہ صرف ایک ادبی صنف نہیں بلکہ ایک فکری اور روحانی درس بھی ہے۔ وہ حضرت امام حسینؓ کی قربانی کو نہ صرف ایک تاریخ ساز واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں، بلکہ اس میں چھپے ہوئے آفاقی پیغامات کو بھی اجاگر کرتے ہیں، جیسے حق و صداقت کی جدوجہد، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور دین اسلام کے اصولوں پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا۔ ان کے مرثیے انسانیت کے لیے ایک رہنمائی فراہم کرتے ہیں، جو مذہبی احکام اور معاشرتی ذمہ داریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

شاہد نقوی اپنے مرثیوں میں علامتی زبان اور استعارات کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں الفاظ محض نمائشی نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے ایک گہرا مفہوم چھپا ہوتا ہے۔ وہ کربلا کے میدان کی عکاسی کرتے ہوئے انسانی روح، عزت و توقیر اور قربانی کی علامتوں کو استعمال کرتے ہیں، جس سے مرثیے کو ایک اعلیٰ سطح کی ادبی رنگت ملتی ہے۔ ان کے اشعار میں ہر علامت ایک نیا معنی پیش کرتی ہے، جو مرثیہ کو ایک تخلیقی اور فکری جہت فراہم کرتی ہے۔ شاہد نقوی کی زبان سادہ، مگر گہری اور تاثیر سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں پیچیدہ لغت یا غیر ضروری طور پر پیچیدہ بیانیے سے پرہیز کرتے ہیں، اور اپنی شاعری کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایک سیدھی اور دل سوز زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں وہ قوت ہے جو ہر عام و خاص تک پہنچتی ہے اور سامع یا قاری کو کربلا کے واقعہ میں شریک کر دیتی ہے۔ شاہد نقوی کے مرثیوں کا ایک اور نمایاں پہلو شہادت اور قربانی کا فلسفہ ہے۔ وہ حضرت امام حسینؓ کی قربانی کو ایک معجزہ تصور کرتے ہیں، جو ظلم کے خلاف عظیم ترین مزاحمت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں شہادت کو فقط موت نہیں بلکہ ایک عظمت اور سربلندی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو مسلمانوں کو ان کے ایمان، عزم اور حوصلے کا مظاہرہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کے اشعار میں شہادت کی جمالیات اور فلسفہ ایک خاص رنگ میں دکھایا جاتا ہے، جو انسان کو ہمت اور حوصلے کا درس دیتا ہے۔ شاہد نقوی اپنے مرثیوں میں صرف واقعاتی بیانیہ تک محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ ان واقعات کے پس پردہ جذبات اور نفسیاتی کیفیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں حضرت امام حسینؓ، ان کے اہل خانہ اور کربلا کے دیگر کرداروں کی نفسیات

اور جذباتی کیفیات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ان کا فن یہ ہے کہ وہ کرداروں کی تکالیف، جذبات اور احساسات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور ان کی حالت کو خود پر وارد ہوتا محسوس کرتا ہے۔

حواشی

1 سید عاشور کاظمی، اردو مرثیے کا سفر (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2021، ص 735

2 راحت حسین ناصری، فن مرثیہ گوئی اور سید آل رضا، وحید الحسن ہاشمی مرتب۔۔۔۔۔۔جدید فن مرثیہ نگاری، ص255

3 یوسف جمال انصاری، جدت اور روایت کا سنگم، وحید الحسن ہاشمی مرتب۔۔۔۔۔۔جدید فن شاعری، ص96

☆☆☆

Awami Intezamia ka buniyadi juz ke taur par ekhlaqiyat aur salmiyat

by Dr. Junaid Khan(Asst. Prof. MANUU,HYD.)cell-7006960409
ڈاکٹر جنید خان (اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

عوامی انتظامیہ کا بنیادی جزو کے طور پر اخلاقیات اور سالمیت

Abstract: قابل قبول عقائید، اصولوں اور اقدار کا ایک نظام ہے جو انسانی رویے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزید واضح طور پر اگر کہا جائے "اخلاقیات" تو یہ نظام اصولوں پر مبنی ہے۔ اگر چہ اس کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب سے انسانی تہذیب ہے اور ہم حکمرانی میں اخلاقیات کے حوالے سیہند وستانی، مغربی، چینی کتابوں، فلسفیوں میں ان کے حوالے پاتے ہیں ان میں رامائن، مہابھارت، ارتھ شاستر ا، لاوسئ، کنفیوشس، ارسطو، امانیول کانٹ پلاٹو ان میں سے چند نام ہیں۔ لیکن ۱۷ ویں صدی کے اوائیل سے اخلاقیات کو اخلاق کی سائینس، کردار کے اصول، انسانی فرائض کی سائینس کے طور پر قبول کیا جانے لگا۔ چناچہ عام زبان میں اخلاقیات کو اخلاقیا صول تصور کیا جاتا ہے جو کسی فرد یا افراد کے رویے کو کنٹرول کرتے ہیں۔

اخلاقیات نظم نسق عامہ کا داخلی حصہ ہیں اخلاقیات اس بات پر توجہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ کسی طرح انتظامیہ کو جوابدہ ہونا چاہئے وہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو سکے۔ اخلاقیات اور نظم ونسق عامہ کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے کہا جاتا ہے کہ اخلاقیات اقدار اور اصول سے نمٹتے ہیں جبکہ نظم ونسق عامہ کا تعلق کام اور فیصلوں سے ہے۔ حکمرانی میں اخلاقیات کی سطح کا انحصار ملک کے معاشی، سماجی، سیاسی، ثقافتی، قانونی، عدالتی اور تاریخی پس منظر پر ہوتا ہے۔

نظم نسق عامہ میں اخلاقیات پر ملک کے تاریخی، ثقافتی، قانونی وعدالتی، سیاسی اور معاشی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ نظم ونسق عامہ کو اخلاقی وکردار کی جواب دہی کئی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ دنیا بھر میں یہ ظرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے کہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے اور مزید انسانی واخلاقی انتظامیہ کی سمت پیشرفت کی جاسکے۔ آج کئی ترقی یافتہ اور کئی ترقی پزیر ممالک دنیا بھر میں انتظامیہ کو مزید بہتر اور جواب دہ بنانے کیلے کی ضوابط اور قوانین بنا رہے ہین جیسے قانون حق معلومات، وزیل

بلورو، اخلاقیات بورڈ، اخلاقیات کی تربیت وغیرہ اس سے انتظامیہ کی اخلاقی صورت گری میں قافی مدد مل رہی ہے۔ اس دستاویز میں نظم ونسق مین اخلاقی جوابدہی کو درپیش رکاوٹوں اس کے معنی، اختراع وغیرہ پر بحث کی جائے گی۔

تعارف: اخلاقیات نظم ونسق عامہ کا داخلی حصہ ہے۔ نظم ونسق عامہ میں اخلاقیات اس بات پر توجہ مرکوز نے کے لئے ہے کہ کس طرح نظم ونسق عامہ کو جو جوابدہ بنایا جائے کہ وہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرے۔ دونوں کہ الگ کرنا بہت مشکل ہے اخلاقیات کا تعلق اصول اور اقدار سے جب کہ نظم و نسق عامہ کام اور فیصلون سے نمٹتا ہے۔ اخلاقیات، قابل قبول عقائد اصولوں اور اقدار کا ایک نظام ہے جو انسانی رویہ پر اڑ رانداز ہوتا ہے یہ اصولوں پر مبنی نظام ہے۔ یہ اخلاقی طور پر کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے اس کا مطالعہ ہے۔ لفظ اخلاقیات کا لاطینی انگریزی لفظ ہے جس کے معنی کردار کے ہیں۔ ۱۷ ویں صدی کے اوائل سے اخلاقیات کو اصولوں کی سائنسی کردار کے اصول، انسانی فرائض کی سائنس کے طور پر قبول کیا جانے لگا۔ چنانچہ اخلاقیات کو ایسے کرداری اصول تصور کیا جاتا ہے جو کسی شخصی یا افراد کے گروپ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس مین اچھائی کی سائنس اور حقیقت کی فطرت دونوں شامل ہیں۔ ہمیں ہندوستانی کتابوں اور دوسری تحریروں میں اخلاقیات کے کافی حوالے مل جاتے ہیں جیسے رامائن، بھگوت گیتا، بدھا، چرترا، ارتھ شاستر وغیرہ۔ حوالہ جات چینی فلسفیوں جیسے لاو تسے، کنفوشس اور فیسوس کی طحریروں مین بھی مل جاتے ہین۔ مغربی مفکرین میں ہم اخلاقیات کو گائڈ لائن فار رولرس میں پاتے ہیں چاہے وہ بادشاہت میں ہو یا جمہوریت میں پلاٹو، ارسطو، تھامس جیفرسن، الگزنڈر ہیملٹن، تھامس پین، جان اسٹورٹ مل، ایڈمند برکے اور دوسروں کی تحریروں سے بھی اس کا حوالہ ملتا ہے۔ اخلاقیات، پس منظر اور نظم ونسق عامہ میں اسکی اہمیت نظم ونسق عامہ کی موجودہ کیفیت میں، مساوات، انصاف، انسانیت، انسانی حقوق، جنسی مساوات اور رحمدلی کے اقدار کو لین ترجیح دی جاتی ہے۔ عالمی بنک کی جانب 1929 میں اچھی حکمرانی کے لئے شروع کی گئی تحریک میں منتظمین کے کردار اور اخلاق پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر یہ نئی عوامی انتظامی تحریک میں انتظامیہ کہ مزید موڑ ربنانے پر توجہ دی گئی ہے نئے انتظامیہ کے منشور میں انتظامیہ اخلاقیات پر بھی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے لئے غیب ہیں۔ اخلاقیات چاہے وہ پورے سماج میں ہو یا سماج ذیلی نظام میں ایک طویل مدت سے چلے ارہے ہیں اور مختلف ماحولیاتی عناصر کی وجہ سے ان کی افزائش ہوئی اور فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہ مختلف حالات کی پیداوار ہیں اور کبھی ترقی اور

تبدیلی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے ہیں۔ اخلاقیات نظم ونسق عامہ کے نظام میں دیگر کے علاوہ ان عناصر سے متاثر ہوتے ہیں۔

تاریخی پس منظر: ملک کی تاریخ کا اس کے حکمرانی کے نظام کے اخلاقی کردار پر بڑا اثر ہوتا ہے امریکہ میں استحصال کا نظام جو کہ ابتدائی مرحلے کے دوران رہا امریکی نظم ونسق عامہ کے اخلاقی پہلوؤں پر اثر انداز رہا۔ امریکی صدر اینڈریو جیکسن نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ فتح استحصال کا شکار لوگوں کی ہے۔ گارفیلد کا قتل امریکہ پر شہری خدمات کے عمل میں اصلاحات لانے کا موجب بن گیا اور 1838 میں قائم کیا گیا امریکی سیول سروس کمیشن اس سمت میں ایک بڑا قدم تھا۔

ہندوستان میں حکمرانی میں غیر اخلاقی عمل کی ایک طویل تاریخ ہے۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں اس وقت انتظامیہ میں پائے جانے والے بدعنوانی کے مختلف طریقوں کو بتایا گیا ہے۔ مغل دور حکومت اور بادشاہتوں کے دور میں جو صدیوں سے جاری بدعنوانی اور انتظامیہ کہ ملاظم بخشش لیتے تھے جو خرید و فروخت کا قابل قبول طریقہ تھا۔ برطانوی دور حکومت میں بھی جاری تھی صورتحال کچھ مختلف نہیں تھی۔

حکمرانی میں غیر اخلاقی حرکتوں کی ایک طویل تاریخ ہے انتظامی بداخلاقی کے لئے رواداری کی سطح میں اضافہ کا امکان ہے ان ممالک میں بھی جو نوابادیاتی ماضی رکھتے ہیں عوام اور حکومت کے درمیان ایک وسیع خلاء پایا گیا اگر چہ اس کا تعلق کی نوعیت کو بدلنے کی کوشش کی گئی کیا انتظامی اخلاقیات پر اس کے غلط اثرات مرتب ہوئے۔

سماجی۔ثقافتی پس منظر: ہم معاشی وتجارتی سماج میں رہتے ہیں جہاں افراد کی یک طرفہ ترقی قابل قبول ہے اور یہاں تک کہ اقدار اور مثالی اقدامات بھی معاشی ترقی کے عملی طریقوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ اقدار جو سماج میں سماجی ضبط کو یقینی بناتے ہیں حکمرانی کے نظام کی نوعیت کو طے کرتے ہیں۔ اج ہندوستانی سماج میں دیکھا جارہا ہے کہ دولت کو کسی بھی دوسرے اقدار پر فوقیت دی جارہی ہے۔ افسوس کے یہ رجحان بڑھتا جارہا ہے اور یہ طریقہ مساوی احترام پر حاوی ہورہا ہے۔ اگر چہ دولت کی چاہت از خود کوئی بری بات نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ تہذیب کو فروغ دیتی ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس سے روزگار کے لئے راستے نکالے جائیں۔

قانونی۔عدالتی پس منظر: ملک کا قانونی نظام، حکمرانی نظام میں اخلاقیات کو موثر بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ شفافیت سے بنائے گئے۔ قانون جس میں منصفانا کردار اور ایمانداری کے اصولوں پر زور دیا گیا ہے سماج میں اخلاقیات کو فروغ دے گا جس کو مہیم قوانین جس میں بدعنوانی کی

اصطلاح اور اس کی وصاحت میں الجھن پیدا کی گی ہے۔رشوت خوری کوفروغ دیں گے علاوہ ازیں ایک موثر اور کارکرد عدالیہ تیز رفتار انصاف رسانی کے نظام کے ساتھ عوامی امور میں بداخلاقی کے لیئے ایک رکاوٹ ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی انسداد رشوت ستانی کا موثر نظام ہے اور جو کچھ بھی موجود ہے وہ بغیر دانتوں کے شیر کے مترادف ہے۔لوک پال بھی قایم نہیں کیا گیا ہے۔لوک ایوکت کمزور ہے جبکہ ریاستی وجیلنس ادارے غیر کارکرد عوامل رکھتے ہیں۔

سیاسی پس منظر: سیاسی قیادت چاہے وہ اقتدار میں ہو یا اقتدار کے باہر،شہریوں کے اخلاق و قردار پر واحد سب سے زیادہ اثر کرنے والی طاقت ہے۔حکمران، ذہنوں پر بھی حکومت کرتے ہیں لیکن جمہوریت میں خاص طور پر یہ تمام سیاسی جماعتیں، دباو بنانے والے گروپس اور ذرائع ابلاغ بھی اخلاقیات کے سوالات پر رویہ اور کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔گر سیاست دان، یکجہتی کی یقینی مثال بن کر کام کریں جیسا کہ شمالی یورپ کے ممالک میں ہوا ہے۔ یا ذاتی مفادات کی مثال کے طور پر جیسا کہ کئی جنوبی ایشیای ءممالک میں پایا جاتا ہے۔انتظامی نظام، سیاسی اخلاقیات سطحوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں انتخابی نظام، سیاسی بدعنوانی کو ہوا دینے والی ایک بڑا طریقہ سمجھا جاتا ہے۔انتخابی مہم پر لاکھوں روپئے خرچ کرنے والی امیدوار مختلف طریقوں سے اپنے اخراجات وصول کرتا ہے۔عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انتظامی طبقہ، جو کہ اعلیٰ، درمیانی ساتھ ہی ساتھ نچلی سطح پر کیسے عوامی خدمت گزاروں پر مشتمل ہے ازخود سماج سے ابھرتا ہے اس لئے فطری طور پر سماج میں اخلاق وکردار کی دار کی جو سطح پائی جاتی ہے وہ ان کے انتظامی کردار سے جھلکتی ہے اور سیاست دانوں کا رویہ عوامی خدمت گذاروں میں سرکاری ملازمین پر قابل لحاظ اثر کرتا ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں اخلاقیات کا ماحول کسی سماجی گروپ کے بجاے سیاست دانوں نے تیار کیا ہے۔میڈیا اپنا رول ادا کرسکتا ہے اور بدعنوانی کو روکنے میں ایک پہرے دار کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ منتظمین میں اخلاقی رویہ کوفروغ دے سکتا ہے۔

اس سمت میں اب رجحان دیکھنے میں آرہا ہے کہ کئی ٹیلی ویژن چینلس نظام میں بد عنوانیوں کا پردہ فاش کرنے والے اپنے پر گراموں کو باقایدگی سے پیش کررہے ہیں۔میڈیا کا رول بہت اہم ہے مگر مگر اس کو سماجی ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا جائے نہ کہ سنسنی خیز بنانے کے مقصد سے۔

معاشی پس منظر: ایک ملک کی معاشی ترقی کی سطح ممکن ہے کہ حکمرانی کے نظام میں اخلاقیات کی سطح سے مثبت تعلق رکھتی ہے۔معاشی ترقی کی کم سطح جہاں معاشی ظبت میں مساوات نہیں ہے ممتن

ہے کہ طبقات اور گروپس کو جن کو کم مراعات حاصل ہیں یا سماج کے انتہائی پسماندہ طبقات کو انکی بنیادی ظرورتوں اور سلامتی کے تقاظوں کو پورا کرنے ایمادارانہ رویے کے اصولوں کے تحفظ سے نالاں کردے۔

اخلاقی جوابدہی میں رکاوٹیں

1۔سماجی مہارتیں اور معلومات: عوامی منتظمین، کارکردگی کے اپنے مخظوص میدانوں میں ماہر ہوتے ہیں اور کسی بیرونی ادارے کے لئے ان کا ان کے مخصوص میدان میں مقابلہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔علاوہ ازیں وہ ایسی اہم معلومات تیار اور کنٹرول کرتے ہیں جن تک رسائی مشکل ہے یا پھر قانون نافذ کرنے والوں کی جانب سے مزید جامع بنا دیا جاتا ہے۔اگرچہ کئی مما لک میں قانون حق معلومات اور ایسے دوسرے قوانین موجود ہیں،معلومات حاصل کرنے کے لئے قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔منتظمین،ایسی معلومات اسانی سے فراہم نہیں کرتے ہیں اور عوام کے سامنے لانے سے پس و پیش کرتے ہیں۔

2۔کل وقتی موقف۔: اکثر عوامی منتظمین کل وقتی ہوتے ہیں،جبکہ بیرونی افراد ان کی رگرمیوں کی نگرانی کے لئے مساوئی وقت نہیں دے سکتے۔متقّنہ،عدلیہ،کمپٹر ولر اینڈ اڈیٹر جنرل اف انڈیا اور یہاں تک کہ ذرائع ابلاغ بھی منتظمین کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے نسبتاً کم وقت رکھتے ہیں۔وہ منتظمین تمام اہم معلومات طلب کرتے ہیں اور اگر وہ ان کو مل بھی جائے تو ان کے پاس ان جائزہ لینے اور ان کو موثر طریقے سے استعمال میں لانے کا وقت نہیں ہوتا ہے۔

3۔ہمیشہ وسعت پزیر بیروکریسی: ہندوستان جیسے ملک میں نظم ونسق عامہ کا رول ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اس کی ریگولیٹری،ترقیاتی ذمہ داروں میں کئی گنا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے حجم میں بھی اس لیئے سیاسی عاملہ یا متقّنہ کے لیئے ان پر موثر کنٹرول مشکل ہے۔اس کے علاوہ بڑے محکمہ جات جیسے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ،انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ، پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہد یداروں کے لئے یہ انتہائی مشکل ہے کہ وہ اپنے ماتحتین کے اخلاق و کردار پر نظر رکھیں۔سرکاری اداروں کی جغرافیا ئی تقسیم بھی کنٹرول کے دایروں کو کافی وسیع کر دیتی ہے جس سے موثر طور پر نمٹنا مشکل ہے اگر ہم تمام شخصی رکارڈ کا کمپیوٹرایزیشن بھی کریں تب بھی تمام افراد کے اخلاق و کردار کی نگرانی کو یقینی نہیں بنا سکتا۔

4۔تعاون کا فقدان: ہندوستان میں نظم ونسق عامہ میں تحقیقات کو یقینی بنانے کے لئے کئی ادارے

ہیں،لیکن ان میں تعاون کا بڑا فقدان ہے۔

5۔حد سے زیادہ تحفظ: دستور ہند کا دفع 1131 ایک سرکاری ملازم کی برترفی کو تقریباً ناممکن بناتا ہے۔حد سے زیادہ تحفظ احساس شخصی امور کے نظام میں پایا جاتا ہے اور تحقیقاتی نظام میں ہی اتنی تاخیر اور رکاوٹیں ہیں کہ اس سے خطرے یا قوت کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہوتا ہے۔

6۔وفاداری: ہندوستان اور کئی ترقی پزیر ممالک میں سرکاری ملازمین میں ادارے کے تئیں جہاں وہ کام کرتے ہیں اور اعلیٰ حکام کے ساتھ جن کے تحت وہ خدمات انجام دیتے ہیں وفاداری کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ہندوستانی سماج میں بڑوں کے لئے احترام دکھانے کی روایت ہے اور ایک عوامی ادارے میں باس پر تنقیدوں سے گریز کیا جاتا ہے۔اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف کوئی بھی اواز کو نافرمانی تصور کیا جاتا ہے۔

7۔ملازمین کی تنظیمیں: اخلاق اور صوابط،ڈسپلن کو نافظ کرنے کی راہ میں ایک اور رکاوٹ ملازمین کی تنظیمیں ہیں جو اپنے ارکان کے خلاف مینیجرل کاروائی سے روکتی ہیں یہاں تک کہ وہ اخلاقی اصولوں کی صریح خلاف ورزی کیوں نہ کریں۔

مستقبل کا منظر: اکیسویں صدی میں انتظامی اخلاق کی نوعیت بیسویں صدی سے کسی طرح الگ ہو سکتی ہے؟اس کا جواب قومی سطح پر اخلاقیات کے لئے بڑھتی تشویش میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔معیشت کی عالمگیریت سے حکمرانی کے مسائل کی عالمگیریت کے لئے راہ ہموار ہونے کا امکان ہے۔مقاصد کی تکمیل،فلاسفی اور نگرانی کے طریقوں کی حکمت عملیاں اخلاقی توجہ ممکن ہیکہ بین الاقوامی سرحدوں میں منتقل ہونگی۔اس سے نظم ونسق عامہ ک روایتی تشویش جیسے موثر انتظامیہ،جوابدہی،ذمہ داری اور ہم اہنگی،مساوات،انصاف،کھلا پن،رحمدلی،انسانی حقوق اور انسانی وقار میں تعیں کے ساتھ ابھرے گی۔امیدہ ء کہ نئی شہریت کے فروغ کا ایک ذریعہ بنے گا جو انتظامی اخلاق کے لئے پابند عہد ہو گئی۔ایسی مثبت شہریت کی افزایش کے لئے نظم ونسق عامہ کے ادارہ جات کو سہولت کار اور معلم کا رول ادا کرنا ہوگا۔یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے ساتھ ہی ساتھ آنے والے وقتوں میں انتظامی نظام کے لئے ایک موقع بھی ہے۔

اختتامیہ: اخلاقیات ایک جامع نظریہ ہے جس میں انتظامیہ کے عام امور شامل ہیں۔اخلاقی اصولوں پر زور ہماری روایات کا اٹوٹ حصہ ہے۔اگر یہ رشوت خوری بدعنوانی اور بیوروکریسی کی فراہمی ہمارے نظام کو اہستہ اہستہ کھا رہی ہے۔اس سے نمٹنے کے اقدامات موثر نہیں ہیں۔انتظامی

اصلاحات اتنے موثر ہونا چاہئے کہ وہ کام کے مقام پر اخلاقیات کی نوعیت، ان کے زاویوں اوران کی تشویش پر تمام سوالات کا احاطہ کرسکتی اور اخلاقی جوابدہی ،احساس اور موثر انداز میں کارکردگی کے لئے اخلاقیات کا ایک ضابطہ خدمات کے قواعد طریقہ کار کے اصولوں اور انتظامی حکمت عملی کے طور پر ہونا ضروری ہے۔ضابطہ اخلاق کو نافذ کرنا ممکن نہیں اگر مفادات کوملحوظ رکھا جائے اور اس میں مسلسل بیرونی مداخلت ہوتی رہے۔ایک حد تک خودمختاری ضروری ہے تا کہ کسی بھی ضابطہ کو کامیاب بنایا جا سکے۔ہم اختیارات فرمابرداری، ڈسپلن کے طریقوں میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں علاوہ ازیں عالمگیریت کیرجحان نے اخلاقیات کے اصولوں اور اقتدار کو عالمی نوعیت میں تبدیل کردیا ہے۔حکمرانی کی فلاسفی بین الاقوامی سرحدوں میں منتقل ہورھی ہے۔

حوالہ جات

References

administrative corruption:causes and ’’Agarwal,U.C,2000, ,Public Policy and ((Ed ’inNoorjahanBava’cure Administration:NormativeConcerns,Uppal,New Delhi.

2004,Public ,(Arora,Ramesh k(Ed • Administration:Fresh Perspectives,Alekh,Jaipur

role of ethics in Public ‹‹Dhameja,Alka,2003, • in Ramesh K. Arora and ’’Administraton ,ethics and accountability in (TanjulSaxena(Eds government and business, Alekh Jaipur

Gore,A 1993,From Red Tape to Results:Creatinga • Government that works better and costs less,Government Washigton D.C, pressprinting

,1995,Government of Vohra Committee Report • India,Ministry of Home Affairs

☆☆☆

Azizullah Shirani : Bahaisiyat Tanz-o-Mizah Nigar by Dr. Mohd. Mustamir(Asst. Prof. dept. of Urdu, Zakir Husain dehli college, Delhi University, New Delhi) cell-8920860709

ڈاکٹر محمد مستمر (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ذاکر حسین، دہلی کالج، دہلی یونی ورسٹی)

عزیز اللہ شیرانی بحیثیت طنز و مزاح نگار

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی شخصیت کئی جہتوں پر محیط ہے بلکہ دن بہ دن ان کی یہ شخصیت کی جہتیں مزید توانا، بلند، اور وسیع ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی شخصیت درحقیقت مثلث، مربع اور مستطیل کا سفر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ ادبی سفر ہنوز جاری ہے اور اس شعر کے مصداق ؎

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر مل جائے تجھ کو دریا تو سمندر تلاش کر

انہوں نے اپنی زندگی اور اپنے مشن کو وطیرہ بنا لیا ہے۔ وہ کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہتے بلکہ پھر نئی چیز کی جستجو میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور اس سرگرمی میں ان کے اندر ایک طرح کی صحرا نوردی اور جنون کی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہ صحرا نوردی آخر کار انہیں اس شے تک پہنچا دیتی ہے جس کے وہ خواہاں نظر آتے ہیں۔ عزیز اللہ شیرانی بیک وقت افسانہ نگار، نقاد، محقق، مدوّن، مرتّب، ماہرِ تعلیم اور شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی اب تک کم و بیش چالیس سے زائد کتابیں طباعت کے مراحل سے گزر کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی کچھ مشہور کتابوں میں ''سنگ زر'' (افسانوی مجموعہ)، ''زخموں کے پھول'' (افسانوی مجموعہ)، تنقیدی و تحقیقی کتابوں میں کاوشِ قلم، ادبی جائزے، تحقیق و تفہیم، ابعادِ بصیرت، راجستھان کے موجودہ اردو شاعر، صحرا میں گلزار اور شعری مجموعہ ''گلشن'' خصوصیت کی حامل کتابیں ہیں۔

دنیا میں کسی بھی شے کا اگر نزول ہوتا ہے یا کوئی بھی چیز وجود میں آتی ہے یا کسی بھی چیز کی ایجاد ہوتی ہے تو اس کے دونوں پہلو کارفرما ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر صرف مثبت رویہ ہی قائم ہو یا صرف منفی رویہ بلکہ مثبت اور منفی دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ کائنات کا وجود ہی تضاد پر منحصر ہے۔ چنانچہ کورونا وبا بھی اگرچہ اپنے ساتھ زیادہ تر منفی پہلو سمیٹ کر

لائی تھی مگر اس کے سماج اور معاشرے پر کچھ مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے۔ کورونا سے یقیناً پوری دنیا نے کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی پہلو سے سبق حاصل کیا ہے۔ تخلیق کاروں نے بھی کورونا لاک ڈاؤن سے خوب خوب استفادہ کیا اور فرصت کے لمحات کو اپنے قیمتی لمحات میں صرف کیا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی کی سرِ دست کتاب ''اکیسویں صدی کا کورونا'' (2024) انہی لمحات کی مرہونِ منت ہے۔ اس کتاب کے توسل سے عزیز اللہ شیرانی کی بالکل الگ ہی شخصیت ہمارے سامنے متشکل اور رونما ہوتی ہے۔ اس کتاب کی روشنی میں عزیز اللہ شیرانی اب طنز و مزاح کے بھی شہسوار بن گئے ہیں۔

اردو ادب میں انشائیہ اور طنز و مزاح کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جب سے نثر وجود میں آئی، تب سے انشائیہ اور طنز و مزاح کے شگوفے اور پھول جھڑیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انگریزی ادب میں یہ صنفِ انشائیہ اور طنز و مزاح کا اسلوب مونتین، فرانسس بیکن، چالرس لیمب، جی کے چسٹرٹن، ورجینیا وولف، اے جی گارڈنر اور رابرٹ لنڈ کی مرہونِ منت ہے۔ اردو ادب میں باضابطہ طور پر یہ سلسلہ محمد حسین آزاد، سر سید احمد خان، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، حاجی لق لق، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، رام لال نابھوی، جاوید وششٹ، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، معین اعجاز، کمال الدین، اعجاز علی ارشد، شفیقہ فرحت سے سفر کرتے ہوئے وزیر آغا، انور سدید، مشتاق قمر، جمیل آذر، سلیم آغا قزلباش، سلمان بٹ، محمد اسد اللہ، اکبر حمیدی، ارشد میر، بشیر سیفی، شہزاد احمد، جان کاشمیری، محمد اقبال انجم، رعنا تقی، شمیم ترمذی، محمد اسلام تبسم، شاہد شیدائی، خالد صدیقی، عبدالقیوم، فیاض احمد فیضی، مختار ٹونکی، محمد مستمر اور عزیز اللہ شیرانی تک آ گیا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی نے مذکورہ کتاب بعنوان ''اکیسویں صدی کا کورونا'' لکھ کر یقیناً طنز و مزاح اور انشائیے کے میدان میں ایک خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب میں پندرہ عنوانات شامل ہیں۔ بطور خالق کہ چھ انشائیے خالص کورونا وبا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن محمد اسد اللہ جو مشہور انشائیہ نگار ہیں انہوں نے اس کتاب پر ''شگفتہ اظہارِ خیال کا عمدہ نمونہ'' کے عنوان سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک کچھ مضمون انشائیے کے دائرے میں داخل ہیں اور کچھ طنز و مزاح کے نمونے۔ پروفیسر فیروز احمد بھی اس کتاب کے تعلق سے اپنے تاثرات کچھ یوں بیان کرتے ہیں ''عزیز اللہ شیرانی کی یہ ایسی کتاب ہے جس کا عام انداز تو انشائیوں کا ہے مگر غایت کے اعتبار سے یہ طنز و مزاح پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔'' مگر راقم کے مطابق اس کتاب کی

صنفی درجہ بندی اس طرح سے ہے: اکیسویں صدی کا بین الاقوامی کورونا، کورونا کا کیا رونا، مجمعوں سے چہل پہل غائب، مچھر کی سنوتو، یہ چاروں عنوانات انشائیے کے تحت شامل کیے جائیں گے۔ دستک کورونا کی، ڈر اور خوف کے سائے، یہ دونوں عنوانات افسانہ اور انشائیے کی درمیانی کڑی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ''کورونا بس آخری سانس کا مہمان ہے'' یہ عنوان مکمل افسانچے کے زمرے میں آئے گا۔ نئی زندگی کی تلاش، ٹرٹراہٹ مینڈکوں کی، پرواز پرندوں کی، سلیکشن آرڈر، دھوپ چھاؤں، یہ چاروں تحریریں مکمل طور پر افسانے کو جنم دیتی ہیں جن میں ''سلیکشن آرڈر'' کو چھوڑ کر تین علامتی افسانے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور جشن، میاں دلگیر، قصہ مضمون چھپوانے کا، یہ تینوں نگارشات خالص طنزیہ ومزاحیہ مضمون کے دائرے میں رکھی جائیں گی۔ حالانکہ یہ بات بھی برصداقت مبنی ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ مضمون میں بھی انشائیہ کے عناصر اور خط وخال نمایاں ہوجاتے ہیں یا یوں کہیے کہ شامل رہتے ہیں۔

ان تمام مذکورہ نگارشات اور تحاریر کے تعلق سے یہ بات بلاخوف وتردد کہی جاسکتی ہے کہ یہ تمام تحریریں اکیسویں صدی کی آواز ہیں، رنگ وآہنگ ہیں، عکاسی ہیں، ترجمانی ہیں، اور مجموعی طور پر کہا جائے تو منظر نامہ ہیں۔ اس اکیسویں صدی کے منظر نامے کو عزیز اللہ شیرانی نے مختلف نثری اصناف کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر اپنے تجربات ومشاہدات، جہاں دیدگی، عرق ریزی، ذہانت و فراست اور شعور وبصیرت سے متشکل کرنے کی سعی پیہم کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی تخلیق کار نے ہر تحریر اور نگارش میں طنز مزاح اور ظرافت کا سہارا لیتے ہوئے سماج اور معاشرے کی چیرہ دستیاں کی ہیں نیز سماج ومعاشرے کے پوشیدہ بدعنوانیوں، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات، کو طشت از بام کیا ہے۔ علامتوں کا سہارا لیتے ہوئے اور جانوروں کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تحریروں سے حقیقت کی رو سے دیکھا جائے تو ایک جراح کا کام کیا ہے جو جسم کے پھوڑوں کو چیر پھاڑ کر اس میں سے مواد نکال کر جسم کو روبہ صحت کرنا چاہتے ہیں۔ ان تحریروں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ عزیز اللہ شیرانی نے معیاری، خوبصورت، دلکش، شگفتہ، شائستہ اور سادہ وسلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کی سادگی اور سلاست میں ایک آبِ زلال کی طرح شفافیت اور روانی موجزن ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں توانائی اور جان پیدا کرنے کے لئے موقع بہ موقع محاوروں، کہاوتوں، مصرعوں اور اشعار کا بھی سہارا لیتے ہیں جس سے زبان رنگین، دل پذیر اور شگفتہ بن جاتی ہے۔ وہ شعروں اور مصرعوں کی جملوں میں اس طرح پچی کاری کرتے ہیں کہ ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ یہ مصرعے اور شعر اسی جگہ کے لئے کہے گئے تھے۔ ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد عزیز اللہ شیرانی کی زبان و بیان پر گرفت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک تجربے کار، منجھے ہوئے اور جہاں دیدہ فنکار ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں بہت گہری اور پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ایسی باتیں جن کا تعلق راست اور براہِ راست سماج اور معاشرے کی رگِ جاں کے قریب ہوتا ہے۔ یعنی کہ ان کی نگارشات مکمل طور پر سماج اور معاشرے کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ عزیز اللہ شیرانی کی مذکورہ کتاب شگفتہ اظہارِ خیال کا عمدہ نمونہ ہے۔ ایسا عمدہ اظہارِ خیال کہ جس میں حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ وہ باتیں اور پہلو پیوست ہیں کہ جن کا تعلق کورونا کے دوران ہر کس و ناکس کے ساتھ رہا ہے۔ کورونا کی وبا اور لاک ڈاؤن کا وقت ایک ایسا پر آشوب دور اور خدائی عذاب تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ پر ایک الگ ہی طریقے کا دہشت و وحشت و خوف طاری تھا اور ہر آدمی ایک عجیب ہی نفسیاتی کیفیت کا شکار بنا ہوا تھا۔ ایسی نفسیاتی کیفیت اور خوفوں کا لامتناہی سلسلہ کہ جس نے انسان کو ہلا کر، کچل کر اور متزلزل بنا کر رکھ دیا تھا۔ انسان کے اندر بیزاری، افسردگی، پژمردگی، مایوسی، بے بسی اور مختلف قسم کا مالیخولیا اور مختلف قسم کے خوفوں کا تسلط کائنات پر سوار تھا۔ لاک ڈاؤن اور کورونا سے متعلق ان کے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد قاری پھر اسی گزرے ہوئے دور کا چند وقت کے لئے حصہ بن جاتا ہے جو کرب و درد اور خوف و دہشت سے وہ لوک ڈاؤن کے دوران دوچار ہوا تھا۔ ایک اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ ایک ہی موضوع کو مختلف پیرائے بیان اور اظہارِ خیال کے ساتھ پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن عزیز اللہ شیرانی نے کورونا وبا جیسے موضوع پر ایک ساتھ کئی تحریریں رقم کی ہیں مگر ہر ایک انشائیے میں ان کا مختلف زاویہ، نقطۂ نظر اور غور و فکر کا دائرہ و حصار دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ حصار ایک ایسا حصار ہے جو ان کی ذات کا بھی حصار ہے اور کائنات کا بھی۔ کیونکہ انشائیہ کی ایک خوبی انکشافِ ذات اور حصارِ ذات بھی ہے اور اسی انکشافِ ذات اور حصارِ ذات میں کائنات کا انکشاف اور حصار بھی مضمر رہتا ہے۔ ان انشائیوں میں انہوں نے اپنی ذات کو بھی مقید کیا ہے اور کائنات کو بھی محصور۔ عزیز اللہ شیرانی لکھتے ہیں:

''ہمیں کبھی بین الاقوامی ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا کہ اس سے پہلے ہی کورونا کی بین الاقوامی دستک سنائی دی، بین الاقوامی بننے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔ البتہ انٹرنیٹ کی جدید ٹیکنالوجی سے ہمیں بین الاقوامی ہونے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ ہماری آرزوئے بین الاقوامی کی راہ نکل گئی۔

اب سیمینار نہیں تو ویبینار ہی سہی کیا خوب ترقی ہے۔''

(اکیسویں صدی کا بین الاقوامی کورونا، ص:25)

مذکورہ اقتباس میں دیکھیے کتنی فنکاری، ہوش مندی اور شعور کی رو سے انشائیہ نگار نے اپنی انکشافِ ذات کو انکشافِ کائنات سے وابستہ کر دیا ہے۔ یہی وہ ہنر اور فنکاری ہے کہ انشائیہ ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہو جاتا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی نے سیمینار اور ویبینار کے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے شاعر و ادیب یا دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ویبینار میٹنگ، جلسے اور پروگرام کرنے لگے۔ یہ ویبینار کا تصور حقیقتاً کورونا کا ہی عطیہ ہے۔ اس سے پہلے ویبینار کا خیال تک بھی لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور نہ ہی یہ اصطلاح رائج تھی۔ اس کے علاوہ انشائیہ نگار نے انشائیہ میں لاک ڈاؤن کے دوران ہونے والی دوسری سرگرمیوں پر بھی فوکس کرایا ہے مثلاً ہر طرف ایک سناٹا قائم ہے۔ مندر مسجد گردوارے، میل، کارخانے سب کچھ بند ہو گیا ہے۔ سڑکوں پر کسی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اقتصادی اور معاشی مسائل نے بھی لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ جہاں جو تھا وہیں پھنسا کا پھنسا رہ گیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں بے روزگار، مزدور نہ جانے کیسے کیسے اپنے گھر تک واپس آئے۔ اس کیفیت کو بھی دیکھیے عزیز اللہ شیرانی نے لطیف اور شگفتہ مزاح اور ہلکے سے طنز کے ساتھ یوں پیش کیا ہے:

'' کارخانوں، میلوں کے مالک پریشان ہیں۔ لاکھوں کروڑوں بے روزگار مزدور ہزاروں کلومیٹر دور جیسے تیسے پہنچے ہیں۔ کچھ دیر بیوی بچوں کے ساتھ گزارے ہیں۔ ایک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا۔ کس سے پکار کریں کوئی سننے والا نہیں۔'' (ایضاً، ص:27)

اس سے آگے بھی خوبصورت اور لطیف طنز و مزاح کے ذریعے کورونا کے تعلق سے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

'' یہ بھی دنیا کا غیر متوقع عجوبہ ہے جو آتا ہے جاتا نہیں۔ اسے تو بس آنے کی کھلی چھوٹ ہے جانے کی نہیں اور جاتا بھی ہے تو جان لے کر ہی جاتا ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی تدارک ایجاد نہیں ہوا اور ہو بھی کیسے۔ اب تو ہر چیز شہری اور ملکی نہیں رہی بین الاقوامی بن گئی ہے تو پھر کرونا کی بیماری بھی عالمی کیوں نہ ہو۔'' (ایضاً، ص:28)

'' کورونا کا کیا رونا'' یہ اگلا انشائیہ بھی بہت اثر انگیز، معنی خیز اور جاذبیت لیے ہوئے ہے۔ اس انشائیہ میں گزشتہ انشائیے کی باتوں کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ دوسرے زاویے سے کورونا کے

تسلط سے ہونے والے اثرات وفعالیت اور زندگی کے تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً پولیس کی سخت ترین کاروائی اور بندش، عبادت گاہوں میں پوجا پاٹھ اور عبادت کی ممانعت، ماسک کا ضروری استعمال اور دوگز کا فاصلہ وغیرہ بلکہ نعرہ ہی بن گیا تھا کہ ''دوگز کی دوری ماسک ہے ضروری''۔ انشائیے میں خوشنما، شگفتہ اور لطافت وظرافت کے ساتھ نصیحت اور سبق آمیز پہلو بھی در آئے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''نہ کھانا نہ پینا نہ روزگار، زندگی تھم سی گئی تھی جسے لوک ڈاؤن کا نام دیا گیا۔ دنیا کی ہر شے لوک ڈاؤن تھی مگر ہمارا قلم ڈاؤن نہیں رکھا۔'' (کورونا کا کیا رونا، ص:34)

اور پھر جب لاک ڈاؤن ختم ہو گیا تو اس کیفیت کو بھی کچھ اس انداز سے عزیز اللہ شیرانی اختتامیہ جملے میں بیان کرتے ہیں:

''سب کی زبان پر کرونا تھا، کرونا جو دن دونی رات چوگنی ترقی پر گامزن تھا۔ مشکلیں اپنے عروج پر تھیں۔ بقول غالب ع

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں۔" (ایضاً)

''مجمعوں سے چہل پہل غائب'' یہ بھی کرونا کے اوپر لکھا گیا انشائیہ ہے۔ عنوان سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ تخلیق کار کیا کہنا چاہتا ہے اور اس نے اس میں کس طرح کی باتیں بیان کی ہوں گی۔ اس انشائیہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن اختصار میں جامعیت ہے۔ ''مچھر کی سنوتو'' یہ بھی عزیز اللہ شیرانی کا اچھا انشائیہ ہے اور اس انشائیے کے ذریعے انشائیہ نگار نے انسانوں کو صاف ستھرائی اور پاکیزگی کی طرف توجہ دلانے کی ترغیب دی ہے۔ ہماری اطراف اکناف اور گردونواح میں مچھروں کا بول بالا پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر گندگی، سیلن نما اور رطوبت آمیز جگہوں پر ہماری شکایت ہی رہتی ہے کہ یہاں مچھر بہت پیدا ہوتے ہیں جبکہ مچھر ہماری غلطی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ انشائیے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''میں ایک نزالہ مچھر ہوں، گندی نالی والا، کوڑے کرکٹ والا، لوگ مجھے نہیں کاٹنے کی صلاح دیتے ہیں، لیکن میں پھر کاٹتا ہوں اس لئے کہ تم صفائی نہیں رکھتے۔ اگر تم نہیں رکھو صفائی، میں نہیں جانے والا مچھر۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا.....'' (مچھر کی سنوتو، ص:61)

''نئی زندگی کی تلاش میں'' افسانہ نگار نے علامتوں، کنایوں اور تمثیلوں کے ذریعے انسان کے ابتدائی اور ارتقائی سفر کو بہت ہی مؤثر، معنی خیز اور نصیحت آمیز طریقے سے پیش کیا ہے۔ افسانہ علامتوں کے سہارے قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے جس میں نہایت روانی اور برجستگی قائم ہے۔ افسانہ کہیں سنجیدہ ہو

جاتا ہے اور کہیں طنز کا پہلو اختیار کر لیتا ہے اور اور کہیں کہیں برائے نام ظریفانہ انداز بھی در آجاتا ہے۔ افسانہ نگار نے رواں دواں، شگفتہ اور شستہ زبان و بیان کے ساتھ بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پورے عالمی منظر نامے، مسائل اور موضوعات کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ عزیز اللہ شیرانی کو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ یقین جانیے افسانے میں انسانی زندگی سے وابستہ تمام طرح کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، معاشی اور نفسیاتی پہلو اور زاویے سمٹ کر ایک محور و مرکز پر مجتمع ہو گئے ہیں۔

عزیز اللہ شیرانی کا ارتکازی و اجتماعی اندازِ افسانہ قاری کو متحیر بھی کرتا ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے نئی زندگی کی تلاش کے عنوان کے تحت انسان کی فطرت، جبلت، سرشت، نفسیاتی پیچ و خم اور اس کے داخلی امراض یعنی بغض و حسد اور تعصب اور نفسیاتی امراض جیسے انتشارِ نفس، اعصابی خلل، نرگسیت وغیرہ نیز نفسِ امارہ، نفسِ مطمئنہ، نفسِ لوامہ کے ساتھ شعوری اور لاشعوری نظام کو بھی قلم کی گرفت میں لینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اسی کے ساتھ ماحولیاتی نظام کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ کل ملا کر یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ جس میں عزیز اللہ شیرانی کا عمیق مشاہدہ اور مشاقانہ تجربہ گو ان کی توجہ، احساس اور ادراک کا مثلث قائم ہے۔ ''ٹڑٹراہٹ مینڈکوں کی'' یہ بھی ایک علامتی افسانہ ہے۔ افسانے میں مینڈک اور مگرمچھ بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔ مینڈکوں اور مگرمچھ کے ذریعے افسانہ نگار نے آج کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے اور المیے پر بات کی ہے۔ آج کا جو ہندوستانی سیاسی منظر نامہ، اتھل پتھل، گٹھ جوڑ اور پینترے بازیاں ہیں نیز نیتاؤں نے مذہب، دھرم اور مندر مسجد کے نام پر جس طریقے سے لوگوں میں خوف و دہشت کا ماحول بنا رکھا ہے، یہ افسانہ علامتوں کے ذریعے اس کی چغلی کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگرمچھ ایسی علامت ہے جو عوام کے ذہنوں پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے اور مسلسل ہر اعتبار سے عوام کا استحصال کر رہا ہے۔ مگرمچھ کے پاس ایسی چالیں ہیں کہ جو سمجھدار اور دانشمند مینڈک کی چالوں کو بھی ناکام بنا دیتا ہے۔ اس کی باتوں میں ایسا جادو، منتر، داؤں پیچ اور منطق ہے کہ تمام مینڈک اس کے جلد ہی بیوقوف بن جاتے ہیں۔ ہندوستان کا اس وقت کا سیاسی منظر نامہ کچھ انہی پہلوؤں اور نکات کا غماز ہے جن کو افسانہ نگار نے اس افسانے میں بہت خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ ضم کر دیا ہے۔ افسانے میں کہیں کہیں انشائیہ کا رنگ اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی تحلیل ہو گئی ہے اور یہ طنز و مزاح کی چاشنی اور انشائیے کا رنگ تحلیلِ نفسی کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ''پرواز پرندوں کی'' بھی مذکورہ بالا افسانے کی ہی رموز و

اسرار میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ بھی پرندوں کے توسل سے انسانی سماج اور معاشرے کے گرد ہی چکر لگاتا ہے۔ چنانچہ اس افسانے میں بھی افسانہ نگار نے ان پہلوؤں اور نکات کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ جس بربادی کے دہانے پر آج انسان بیٹھا ہوا ہے اور اس بربادی کا ذمہ دار وہ خود ہے ۔خواہ وہ بربادی اخلاقی زوال کی ہو یا تعصب و کینہ و بغض و عناد کی یا ماحولیات کی یا خوراک کی یا پھر زندگی سے متعلق دوسرے مسائل کی ان سب کا ذمہ دار خود انسان ہے۔ اس نے خود اپنے لیے خندق کھودی ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہم آزادی سے کیسے پرواز کر سکتے ہیں، ہم مجبور ہیں، ہم بے کس ہیں، ہم آزاد نہیں ہیں۔ شاید یہ پرندہ بھی آسمان میں انسانی پابندیوں کا شکار ہوا ہو۔ شاید ماحول خراب کر دیا گیا ہو، فضا میں آخر کتنی آلودگی ہو گئی ہے۔ پہلے ایسا نہ تھا، آسمان صاف ہوتے تھے، موسم سہانے ہوتے تھے، آسمان میں اڑنے کا بھی جی چاہتا تھا لیکن اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ دل میں اب تو اُڑنے کی خواہش بھی نہیں رہی۔'' (پرواز پرندوں کی، ص:65)

''سلیکشن آرڈر'' ذرا الگ ہٹ کر افسانہ ہے۔ افسانے کا تار و پود بہت جاندار، منظم اور مربوط ہے۔ پلاٹ بھی عمدہ ہے۔ بیانیہ بھی دل کو چھوتا ہے اور افسانے کی کہانی بھی دل و دماغ پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ افسانے کی کہانی یہ ہے کہ کہانی کار کے اندر بہت ساری خواہشیں جنم لیتی ہیں۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے دل کی مراد بر آئیں۔ وہ بھی ترقی کرے۔ وہ بھی انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ اس کے بھی ادبی کارناموں کا اعتراف ہو۔ اس کا بھی سماج میں ایک نام اور مقام پیدا ہو۔ زندگی کی دوڑ دھوپ میں وہ مختلف قسم کے حربے، ہتھکنڈے اور فارمولے استعمال کرتا ہے مگر کامیابی ابھی اس کے قدم چومنے کو تیار نہیں ہے مگر افسانہ نگار نا امید نہیں ہوتا اور آخر کار ایک دن اس کو بھی ''سلیکشن آرڈر'' مل ہی جاتا ہے۔ افسانے کا لب لباب یہی ہے کہ انسان جب دوڑ دھوپ کرتا ہے تو خدا بھی اس کی محنت نہیں رکھتا۔ افسانے میں افسانہ نگار نے طنز و مزاح کا بھی سہارا لیا ہے اور اس طنز کے ذریعے سماج، معاشرے اور سسٹم کے خلاف محاذ چھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ افسانے میں وحدتِ تاثر قائم ہے۔ افسانے کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اب ہماری عقل ٹھکانے آئی، گھر کا سکون کیا ہوتا ہے؟ وہ تمغے اور ایوارڈ سے بڑھ کر ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے گھر سے دور رہ کر سات سال لگے۔ یقین جانیے یہ سات سال حاتم کے سات سوال حل کرنے سے زیادہ کٹھن تھے۔ غرض چند ہی دنوں میں ہمیں ایک بند لفافہ ملا، جس میں ہماری قسمت بند

تھی،لفافہ کھولا تو قسمت کھل گئی،وہ ہمارا سلیکشن آرڈر تھا۔'' (سلیکشن آرڈر،ص:70)

''دھوپ چھاؤں'' بھی ایک مختصر علامتی افسانہ ہے۔ دھوپ چھاؤں یہ دونوں استعارے انسان کی زندگی کے ہیں۔ جیسا کہ راقم الحروف نے اوپر بھی عرض کیا ہے کہ کائنات کا حسن اس کے تضاد میں مضمر ہے۔ اگر یہ تضاد کا وصف نہ ہو تو کائنات بے حسن اور زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ہمیں چیزوں کی اہمیت کا اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب نفی اور مثبت دونوں پہلو کارفرما ہوں۔ صبح کی حقیقت شام سے ہے، رات کی حقیقت دن سے ہے۔ زمین کی حقیقت آسمان سے ہے۔ اسی طرح پوری کائنات کا وجود تضاد پر ٹکا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے انہی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے اور اشارہ کیا ہے کہ کوئی بھی چیز کمتر نہیں ہے اور کسی کو بھی کمتر نہیں آنکنا چاہیے۔

ایک اور جشن، میاں دلگیر اور قصہ مضمون چھپوانے کا، یہ تینوں مضمون مکمل طنز و مزاح کے نمونے ہیں۔ ان تینوں مضامین میں عزیز اللہ شیرانی نے اپنے مغز اور دماغ کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ تینوں مضمون میں طنز کے نشتر ہیں وہ نشتر جو خالص ہلکی سی چبھن کا احساس کراتے ہیں۔ انسان کو زخمی نہیں بناتے اور نہ اس کی دل شکنی کرتے ہیں۔ مزاح ایسا جس سے بدتہذیبی، تضحیک اور تذلیل نمایاں نہ ہوں بلکہ ایک شگفتہ ہنسی زیرِ لب تیر جائے۔ ظرافت ایسی جو دل کو گدگدائے، دماغ میں سرور اور سرمستی پیدا کرے اور کچھ مثبت سوچنے اور سمجھنے کے لئے ذہن سازی کرے۔ ایسی ہی خوبیوں اور خصوصیات سے یہ تینوں مضامین مزین ہیں۔ جن میں ادبی شان وشوکت، نفاست کے پہلو اور نزاکت کی پھول جھڑیاں فضا کو معطر اور خوشگوار بناتی ہیں۔ ''قصہ مضمون چھپوانے کا'' ایک ایسا طنزیہ و مزاحیہ اور شگفتہ مضمون ہے کہ جس میں مضمون نگار نے اپنی ذات کو بنیاد بنا کر مضمون چھپوانے کے تعلق سے دلچسپ، حیرت انگیز اور ہنسانے والے واقعات کو ظرافت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ مضمون نگار کیسے کیسے مضمون چھپوانے سے لے کر پھر خصوصی شمارہ، اس کے بعد کتاب کی ترتیب اور پھر صاحبِ کتاب ہونے تک کی پوری داستان اور ادبی گٹھ جوڑ نیز شہرت کے لئے اپنائے جانے والے تمام ہتھکنڈوں اور حربوں کا ذکر بہت ہی پر اثر انداز میں کیا ہے۔ ایک ہی مضمون میں ہیر پھیر کر کے، ردوبدل کر کے اور عنوان بدل بدل کر کیسے وہ لوگوں کا بیوقوف بناتا ہے اور اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے اس مضمون کے توسل سے اپنی ذات کو بنیاد بنا کر تمام ادب کے ٹھیکے داروں جو واقعی کسی صلاحیت اور لیاقت کے مالک نہیں ہوتے اور سرقہ بازی، ترمیم و تنسیخ اور تحریفات سے دوسرے کی تخلیقات کو اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں، ان کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ دراصل یہ مضمون حقیقی ادبی منظرنامے کو بیان

کرتا ہوا صداقت پر مبنی ہے۔ یہ اقتباس بطور نمونہ پیشِ خدمت ہے:

''لیکن اس طرح کہ کبھی اس کا عنوان بدل دیتے تو کبھی اس کی عبارت۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہی مضمون کسی کتاب کا پیش لفظ بن کر سو دو سو روپیوں سے لے کر ہزار دو ہزار روپے تک بک جاتا۔ اور کہیں ہمارا وہی مضمون اداریہ کہلاتا۔ اور کبھی کبھی دو سیمیناروں میں پڑھ دیا جاتا۔ آپ سوچیں گے ایسا کیسا مضمون ہوگا جو ہر مرتبہ اپنا چولا بدل لیتا ہے۔ اگر آپ نے ہیئتی تنقید پڑھی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے مضمون کی ہیئت ہر بار بدل دی جاتی تھی اور ہماری قسمت میں چاندی ہی چاندی تھی۔''

(قصہ مضمون چھپوانے کا، ص:91)

''ایک اور جشن'' اور ''میاں دلگیر'' یہ دونوں مضمون بزلہ سنجی اور ظرافت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر بھی ذکر کیا ہے کہ عزیز اللہ شیرانی نے ان مضامین میں مغز اور دماغ کا نچوڑ پیش کر دیا ہے تو یہ مبالغہ نہیں ہے۔ ''ایک اور جشن'' میں عزیز اللہ شیرانی نے ایک ایسے کردار کو تخلیق کیا ہے جس کا نام مچھو میاں ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''میاں دلگیر'' مضمون میں میاں دلگیر کے مزاحیہ کردار کو اپنی ذہنی زرخیزی سے طنز و مزاح کی دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ میں یہ بات وثوق اور دعوے کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح اردو نثر میں بہت سے مزاحیہ کردار آج بھی ہمارے دل و دماغ اور شعوری سطح پر چھائے ہوئے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ لاشعوری نہاخانوں میں گھر کر گئے ہیں۔ اسی طرح عزیز اللہ شیرانی کے یہ دونوں مزاحیہ کردار بھی لازوال ہو گئے ہیں۔ لفظِ لازوال میں نے خواہ مخواہ ہی استعمال نہیں کیا ہے بلکہ جب قاری ان دونوں مضامین کا مطالعہ کرے گا تو وہ یقیناً میرے مذکورہ قول پر ایمان ضرور لائے گا۔ اردو نثر کہ دیگر مزاحیہ کرداروں مثلاً مشتری، بی نورن، میر صاحب، مرزا ظاہر دار بیگ، خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، قاضی جی، غفور میاں، پاندان والی خالہ، خلیل خان فاختہ، قاضی جی، مرزا عبدالودود بیگ، قبلہ اور حکیم صاحب کی طرح مچھو میاں اور میاں دلگیر کے کردار بھی اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور عزیز اللہ شیرانی کو ان کے کرداروں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ''مچھو میاں'' اور ''میاں دلگیر'' یہ ہمارے معاشرے کی وہ کردار ہیں جو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بستی میں ضرور نظر آ جاتے ہیں۔ ان دونوں مضامین میں ان دونوں کرداروں کی کارگزاریوں، حرکت و عمل نیز اعمال و افعال اور حرکات و سکنات اور نفسیاتی عوامل کو عزیز اللہ شیرانی نے بہت ہی خوشگوار موڈ اور مزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''مچھو میاں'' اور ''میاں دلگیر'' کے کردار جب ہمارے سامنے گردش کرتے ہیں اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں تو ہمیں ان شاء اللہ خان انشاء، سجاد

حسین، سلطان حیدر جوش، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، میر باقر علی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ جیسے طنز ومزاح نگاروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

الغرض مجموعی طور پر عزیز اللہ شیرانی کی اس نئی کتاب ''اکیسویں صدی کا کورونا'' کے تعلق سے یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہمارے سامنے اس کتاب کے توسل سے ایک نئے اوتار کے روپ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ان کا یہ نیا اوتار ہلکا پھلکا نہیں ہے بلکہ سماج اور معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کرنے والا ہے۔عزیز اللہ شیرانی ابھی تک ہمارے سامنے ایک افسانہ نویس، نقاد، محقق اور شاعر کے طور پر مسلم و مستحکم تھے اب ان کا شمار یقیناً اچھے طنز ومزاح نگاروں میں بھی کیا جائے گا۔

☆☆☆

Hindustani Jamhooriyat mein taleem ke numayan pahlu by Dr. Shafayat Ahmad(Associate Prof. MANUU CTE, Darbhanga)
ڈاکٹر شفاعت احمد (ایسوسیئٹ پروفیسر، مانوسی ٹی ای، دربھنگا) cell-7091490018

ہندوستانی جمہوریت میں تعلیم کے نمایاں پہلو

ہندوستان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہندوستان کو ازادی اسانی سے حاصل نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے عوام نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی اواز بلند کی، لڑائیاں لڑی، اپنے خون بہائے اور تبھی یہ ممکن ہو پایا کہ 15 اگست 1947 کو برطانوی تسلط سے ازاد ہوا۔ اس وقت کا ہندوستان جمہوریت کے اصولوں سے متاثر ہوکر ازادی، مساوات، بھائی چارے اور انصاف کی بنیاد پر ایک حکومت قائم کی اور ہندوستان کو چلانے کے لیے ائین چاہیے تھی جو نومبر 1949 کو تیار ہوا۔ 26 جنوری 1950 کو اس ائین کو نافذ کرتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان ایک خودمختار جمہوری ریپبلک ملک ہے جو پورے ہندوستانی عوام کے خیالات کا اظہار، عقیدہ، مذہب وعبادت کی ازادی کا مواقع فراہم کرتی ہے اور تمام شہریوں میں مساوات اور بھائی چارے کے جذبات کو فروغ دے کر سیاسی، اقتصادی وسماجی انصاف قائم کرے گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے تعلیم کی اہمیت و افادیت کو بالکل ضروری سمجھا گیا اور ائین میں ارٹیکل 45 کے مطابق یہ قرار دیا گیا کہ ملک کی تمام ریاستیں ائین کے لاگو ہونے کی تاریخ سے 10 سال کے اندر 6 سے 14 سال تک کے ہر بچے کے لیے لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام کرے گا۔ ہندوستانی سرکار نے اس مقاصد کے حصولیابی کے لیے مختلف ادارے جو پرائمری سطح، ثانوی سطح، اعلیٰ ثانوی سطح کے ساتھ ساتھ کالجوں اور یونیورسیٹیوں کا قیام عمل میں ایا۔

اداروں کا مقاصد فرد کی نشوونما کرنا ہے تاکہ وہ ملک کی ترقی میں تعاون کر سکے۔ دنیا کا ہر ملک ترقی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ ترقی میں سماجی، اخلاقی، اقتصادی، ثقافتی اور دیگر پہلو شامل ہیں۔ اس لیے ہندوستان کی سرکار نے ازادی حاصل کرنے کے بعد مختلف قسم کے کمیشن، پالیسی، پروگرام اور ابھیان لاتے رہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن (1948-49)

حالانکہ اس کمیشن کا تعلق اعلیٰ تعلیم پر تھا لیکن اسکولی تعلیم سے متعلق مسائل پر بھی غور وفکر کیا گیا۔ اس کمیشن کو رادھا کرشن کمیشن کے نام سے بھی جانتے ہیں جس نے بتایا کہ یونیوسٹی کا مقصد ایسے قابل شہری پیدا کرنا ہونا چاہئے جو مختلف شعبوں میں کامیابی سے قومی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ کمیشن نے بتایا کہ یونیورسٹی مختلف پیشوں اور صنعتوں کے لیے موزوں کارکن اور قابل منتظمین پیدا کرتا ہے۔ یونیوسٹی ایجوکیشن کمیشن نے عام تعلیم کو متعارف کرانے پر بہت زور دیا۔ کمیشن واضح طور پر چاہتا تھا کہ اسکول اپنے نتائج کو اس طرح متنوع بنائے کہ بہت سے لوگ ملازمت یا خود روزگار کے ذریعے حقیقی زندگی میں موثر طریقے سے حصہ لے سکیں۔

سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (1952-53)

اسکول کو جمہوری شہریت کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرنے کا تصور اس بات پر زور دیتے ہوئے کیا تھا کہ جمہوریت یقین اور ہر ایک فرد کے وقار اور قدر پر مبنی ہے۔ کمیشن نے تعلیم کے مواقع پر بھی زور دیا جو سماجی انصاف کے جذبے کو عملی جامہ پہنائیں۔ یہ کمیشن ثانوی تعلیم سے متعلق، تدریس کے طریقے، نصابی کتب، نظام امتحان میں بہتری، تعلیم اور پیشہ ورانہ رہنمائی پر زور، تین زبانوں کا فارمولہ، متنوع کورسیز، تعلیم کا تین سالہ قومی نظام تیار کرنے کی متعارف کرائی۔

کوٹھاری کمیشن (1964-66)

کوٹھاری کمیشن (1964-66) کے مطابق تعلیم کا مقصد پیداواری صلاحیت کو بڑھانا، سماجی اور قومی اتحاد کو فروغ دینا، جمہوریت کو مستحکم کرنا اور سماجی اخلاقی اور روحانی اقدار کو فروغ دینا تھا۔ قومی ترقی میں تعلیم کا اہم کردار اس کی رپورٹ جس کا عنوان تعلیم اور قومی ترقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کمیشن نے تین اہم پہلوں کی نشاندہی کی جو مطلوبہ تعلیمی حل کے لیے مناسب تھیں۔ پہلا اندرونی تبدیلی تاکہ اس کا تعلق زندگی کی ضروریات سے ہو۔ دوسرا معیار کی بہتری تاکہ حاصل کئے گئے معیارات مناسب ہوں اور بین الاقوامی سطح پر موازانہ ہو سکے، تیسرا تعلیمی مواقع کی مساوات پر زور دینے کے ساتھ افرادی قوت کی ضروریات کی بنیاد پر تعلیمی سہولیات کی توسیع۔ اس کمیشن نے 10+2+3 یکساں پیٹرن میں تعلیم کی تنظیم نو کی تجویز دی۔

نیشنل پالیسی ان ایجوکیشن (1968)

نیشنل پالیسی ان ایجوکیشن (1968) کا مقصد قومی ترقی، مشترکہ شہریت اور ثقافت کے

احساس کوفروغ دینا اور قومی یکجہتی کو مضبوط کرنا ہے۔اس نے تعلیمی نظام کی بنیاد تعمیر نو کی ضروریات پر زور دیا تا کہ اس کے معیار کے تمام مراحل کو بہتر بنایا جا سکے اور سائنس اور ٹکنالوجی، اخلاقی اقدار کی ابیاری اور تعلیم اور لوگوں کی زندگی کے درمیان قریبی تعلق پر بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ یہ پالیسی نے ائین کے ارٹیکل 45 کے تحت ہدایتی اصول کی جلد تکمیل کے لیے بھرپور کوششیں کی جانی چاہیے کیجانب توجہ مرکوز کی۔ اسکول میں Wastage اور Stagnation کو کم کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تیار کیا جائے کہ اسکول میں داخل ہونے والے ہر بچہ کامیابی کے ساتھ مقررہ کورس مکمل کرے۔

نیشنل پالیسی ان ایجوکیشن (1986)

1986 کی پالیسی (NPE1986) نے 1960 کی پالیسی کے ذریعے طے شدہ پالیسی اہداف کے حصول کو تسلیم کیا۔ جیسے ایک کلومیٹر کے اندر اسکول کا قیام اور مشترکہ تعلیمی ڈھانچے کو اپنانا۔اس کے ساتھ ہی اس پالیسی نے 10+2+3 کے منظور شدہ ڈھانچے کی بنیاد پر ایک قومی نظام تعلیم تجویز کی۔ یہ پالیسی نے لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کے مواقع اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کو دور کرنے پر زور دیا ہے۔

1990 میں اچاریا راما مورتی کی سربراہی میں کمیشن اس لیے بنائی تا کہ قومی پالیسی کے اثرات کا جائزہ لے۔1992 میں N. Janardan Reddy کی قیادت میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ اف ایجوکیشن کے طرف NPE کی کچھ ترامیم پر غور کرنے کے بعد جو رپورٹ پیش کی، جسے نیشنل پروگرام اف کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے اس میں ترقی کا فروغ اور قومی یکجہتی کو مضبوط بنانے پر زور دیا گیا تھا۔ یہ رپورٹ تعلیمی معیار میں اضافے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ہندوستانی تعلیمی نظام کی زیادہ سے زیادہ تبدیلی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے طلبا میں اخلاقی اقدار کے فروغ دینے اور تعلیم کو زندگی کے قریب لانے پر بھی زور دیا۔سروشکشا ابھیان ایک مرکزی حکومت کا پروگرام ہے جس کا مقصد ابتدائی تعلیم کو ایک مقررہ وقت میں عالمگیر بنانا ہے۔ یہ ابھیان اس بات کے طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ تعلیم تک رسائی فراہم کرنے میں بنیادی دھانچے کی دستیابی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے علاوہ مشن نے محروم شہری بچوں تک پہنچنے کے لیے مخصوص حکمت عملیوں کو تیار کرنے، فنڈ دینے اور اس پر عمل درامد کرنے کی کوششوں میں اضافہ کی حوصلہ افزائی کی۔ وہیں رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ 6 سے 14 سال کے عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتا ہے جس نے تعلیم کو ہر

بچے کا بنیادی حق قرار دیا۔

آج کے وقت میں جو پالیسی سامنے ائی ہے اسے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نام سے موصوم کیا جاتا ہے۔ اس پالیسی کا مقصد ہندوستان کو ایک علمی معاشرے میں تبدیل کرنا ہے۔ یا پالیسی پانچ رہنما ستونوں پر مبنی ہے: رسائی، مساوات، معیار استطاعت اور جوابدہی۔ یہ پالیسی ایک نیا تعلیمی دھانچہ بھی 4+3+3+5 ماڈل ڈھانچہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس ماڈل میں بنیادی مرحلہ، درمیانی مرحلہ اور ثانوی مرحلہ شامل ہیں۔ NEP2020 کا مقصد طلبا اساتذہ اور دیگر اہلکاروں کے درمیان تنوع کے احترام کو فروغ دے کر شمولیت اور مساوات کو فروغ دیتا ہے۔ یہ پالیسی اعلیٰ تعلیم کے لیے معیاری یونیورسٹی اور کالجوں کی بھی بات کرتا ہے۔

حوالہ جات

(1) اگروال، ایس پی اگروال، ایس پی (1992)۔ ہندوستان میں تعلیمی منصوبہ بندی کنسیپٹ پبلشنگ کمپنی۔ نئی دہلی۔

(2) بسواس، اے اور اگروال، ایس پی (1956)۔ ہندوستان میں تعلیم کی ترقی۔ کنسیپٹ پبلشنگ کمپنی نئی دہلی۔

(3) چاند، جے (2007)۔ قدیم اور قرون وسطی کے ہندوستان میں تعلیم۔ انشاہ پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

(4) پرہار، این کے (2003)۔ اکیسویں صدی میں تعلیم کا وژن۔ ریفرینس پریس۔ نئی دہلی۔

(5) راؤ، وی کے (2004)۔ نظام تعلیم۔ اے پی ایچ پبلشنگ کارپوریشن نئی دہلی۔

(6) شرما، آر این (2006)۔ ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ اور مسائل۔ سرجیت پبلیکیشنز۔ نئی دہلی۔

☆☆☆

Josh Malihabadi : Ek Inquilabi Shayar by Dr. Orusha Yasmeen Zeba

ڈاکٹر عرسہ یاسمین زیبا (دربھنگہ) cell-8540808860 (Darbhanga)

جوش ملیح آبادی: ایک انقلابی شاعر

شاعر اپنے عہد کا عکاس ہوا کرتا ہے۔ اپنے اردگرد کے حالات و ماحول کو اپنی تحریروں کے ذریعہ منظر عام پر لانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اردو شاعری کی دنیا کے یہ ستارے اپنی مخصوص روشنی سے دنیا کے مختلف حصوں میں روشنی بکھیرنے کا کام کرتے ہیں۔ کسی بھی شاعر کی تحریروں سے اس کے عہد کی تصویریں نمایاں ہوتی ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی شاعری کا جائزہ جب ہم لیں تو پہلے اس کے عہد کی پوری پوری جانکاری حاصل کرلیں۔ جوش ملیح آبادی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں غزل کا بول بالا تھا۔ جوش کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے بزرگوں نے اردو شاعری پر جو احسانات کئے ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جوش نے بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر اردو شاعری کی دنیا کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے انسانی ذہن میں ایک انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جوش نے الفاظ سے کام لیا اور آزادی کے متوالوں کو اپنی تحریروں کے جادو سے سرشار کیا اس کے دلوں میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی:

چونکئے ذرا ہوائیں گرم آنے والی ہیں ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہونے والا ہے

جوش کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کو بہت عزیز سمجھتے تھے۔ ان کی شخصیت ایک محب وطن کی حیثیت سے بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے اور رہنمائے قوم کی حیثیت سے اتحاد و یکجہتی میں نمایاں کارنامہ انجام دے رہے تھے اپنے وقت کے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اٹھ اے ندیم کہ رنگ جہاں بدل ڈالیں زمیں کو تازہ کریں آسماں بدل ڈالیں
نظام وحدتِ قیام کا ہے یہ شور کہ یہ تصور سود و زیاں بدل ڈالیں

۱۹۲۵ء کے بعد جوشؔ کے ذہن نے ایک نئی کروٹ لی۔ وہ مجاہد آزادی کی حیثیت سے

میدان میں اتر آئے۔ان کی شاعری میں کاکل ورخسار کی جگہ ملکی وقومی مسائل نے بھی جگہ بنایا شروع کر دیا۔اس نوعیت کے ایک شعر ملاحظہ کریں:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

انگریزی سامراج کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا اسے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹایا۔ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی جنگ آزادی کے قریب لانے کی کشش کی۔وہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔طرح طرح کے مظالم جو اس وقت ہندوستانیوں پر کئے جارہے تھے اس کے خلاف انہوں نے قوم کے دلوں میں اپنے کلام کے ذریعہ آزادی کا جذبہ جگایا انہیں آزادی سے محبت اور غلامی سے نفرت کرنے کا سلیقہ سکھایا نہ صرف خود کو بلکہ تمام مجاہدین آزادی کو سامراجی چال سے بچنے کی ہدایت دی۔وہ لکھتے ہیں:

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

جوش نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں جذبۂ آزادی کی روح پھونک ڈالی۔ان کے دلوں کو انگریزی حکومت کی غلامی سے آزاد ہونے کا حوصلہ بخشا یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے ہم پیشہ (شاعر) افراد سے بھی اپنے ادبی سرمایہ میں انقلاب پیدا کرنے اور ہندوستان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی گزارش کی۔انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو ظلم واستبداد کئے وہ تاریک میں ہمیشہ یادگار رہیں گے حالانکہ ہندوستان کی آزادی کے جانباز سپاہی اپنے سینے پر گولیوں کو روکتے ہوئے میدان آزادی میں ڈٹے ہوئے تھے۔ایسے حالات میں جگہ جگہ ہونے والا دنگا فساد آزادی کی راہ میں رکاوٹیں بن کر سامنے پیش آرہا تھا۔اس وقت جوش نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے تمام ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستانیوں کو اس نئے خطرے سے آگاہ کریں اور انہیں ایک جٹ ہوکر رہنے کی تلقین کریں۔خود ہندو اور مسلمان کو اس طرح مخاطب کیا:

توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے بستۂ کشمکش سبحہ وزنار نہ بن

پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن مر کے بھی جنس غلامی کا خریدار نہ بن

جوش ایک حساس دل رکھتے تھے انہیں اس وقت کے ہندوستان کی صورتِ حال کا پورا پورا پتہ تھا انہوں نے اپنے وطن کی خدمت میں جان دینے کا وعدہ کیا تھا۔انہوں نے اپنے وطن کی پکار کو محسوس کیا اور اس کے لئے اپنی پوری طاقت کا استعمال کیا نیز اپنی نظموں کو شرارہ کا پیرہن بخش کر لوگوں

کے دلوں میں بٹھایا آزادی کے لئے انہوں نے جو قربانیاں پیش کیں انہیں نظموں میں بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن آزادی ملنے پر بھی لوگوں میں کوئی تبدیل رونما نہیں ہوئی نہیں غربت و جہالت تنگ نظری بے رحمی اور بڑھ گئی لوگ اب مذہب تخت وتاج اور دولت وثروت کے لئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آرہے تھے ان سبھی کیفیات کو جوش نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ
کماں ہیں تیر حرب ہے مکیں میں شہر یار خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

جوشؔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان کو سیاسی آزادی تو مل گئی لیکن انسانی ذہن و دل کو ابھی پوری طرح غلامی کی زنجیر جکڑے ہوے ہے یہ آزادی جوشؔ کی نظروں میں نامکمل تھی وہ ایک ایسی قوم کے خواہاں تھے جو دین و مذہب کے جھگڑے سے دور صرف انسان ہوں اور اس آزادی کو عوامی آزادی کو پیکر بخشا خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے جب تک یہ قوم دین و مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے لڑتے رہیں گے اس وقت تک ہندوستان ایک مکمل آزاد ہندوستان کی شکل نہیں اختیار کرسکتا جوشؔ نے اپنی نظم ''ترانۂ آزادی وطن'' میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:

اٹھو کہ اس زمیں کو ہم آسماں بنائیں گے عمارتوں کو پھونک کر عمارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر فراز کو جھکائیں گے سفینہ بحر نور میں غرور سے چلائیں گے
اگرچہ اپنے گرد و پیش آج موج نار ہے بہار پھر بہار ہے ،بہار پھر بہار ہے

جوش ملیح آبادی نے زندگی کے کئی اہم پہلوؤں پر نظمیں کہی ہیں اور جذبات نگاری میں بھی جذبے کو ابھارنے کے ساتھ جذبے کی قدر کرنے کا بھی احساس دلایا ہے اس طرح نئی روایت کا بھی آغاز کیا ہے۔ان کی جذبات نگاری اس لئے بھی رومانوی فن کاروں میں ایک مستقل اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔جوش کی نظموں میں ماضی سے ان کا لگاؤ محبوب سے جدائی پر اظہار غم ان کے اداسی میں دل کا درد، الم بھی صاف محسوس ہوتا ہے۔''ربودگی'' میں ان کی اداس کیفیت دیکھئے:

ہو چکا ہے غروب بدر منیر سامنے اب نہیں کوئی تصویر
ہو چلا ہے اداس ہر منظر کیوں میں بیٹھا ہوں اب پہاڑی پر

جوش ملیح آبادی کو ابتدا ہی سے مناظر فطرت سے اور اس کے حسن سے والہانہ لگاؤ رہا ہے ۔انہیں فطرت کے ذرے ذرے سے پیار رہا ہے۔وہ فطرت کے حسین جلوؤں کو اس انداز سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی فطرت کے حسن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔اس ہم

آہنگی کو وہ اپنی نظم ''نغمۂ سحر'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں
مراد مانغ سحر پرستی ہمیشہ اس وقت جاگتا ہے
فلک پہ جس وقت چاند ہوتا ہے ملگجے خواب پیرہن میں

جوش ملیح آبادی کو صبح سے بے پناہ محبت تھی۔ آبادی سے دور ایک محل مناظر فطرت کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے تعمیر کرایا تھا جس کا نام ''قصر سحر'' رکھا تھا۔ فطری حسن اور مناظر قدرت سے وابستگی اس قدر تھی کہ وہ اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہو گیا خوبیٔ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہمدم سبزہ زار وکوہ وصحرا ہو گیا دوست میرا چشمہ وگلزار دریا ہو گیا

جوش ملیح آبادی نے مناظر فطرت کے مختلف پہلوؤں پر رومانوی انداز سے بھرپور بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں ''سیر کردوں''، ''چاندنی''، ''برسات کی پہلی گھٹا''، ''بدلی کا چاند''، ''المیلی صبح''، ''بہار آنے لگی''، ''برسات کی شفق''، ''شام کی بزم آرائیاں''، ''برسات کا پچھلا پہر'' وغیرہ سدا بہار نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ رومانوی ادب میں جوش کا ایک اہم اور منفرد مقام ہے۔ فطرت اس کا اس کا حسن جوش کے یہاں بے جان نہیں بلکہ وہ حیات آفریں اور حیات خیز ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوشؔ فطرت کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں آبشاروں کا جوش وترنم ہے۔ دریا کی روانی، موجوں کا تلاطم ہے۔ ان کی شاعری میں تنوع اور ہم آہنگی ہے جو فطرت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس طرح ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں جوشؔ ملیح آبادی ایک رومانوی فن کار ہیں۔ ان کا تخیل زبردست پیکر سازانہ قوت رکھتا ہے۔ وہ تصویریں اور مرقع ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے نقش حرکات وسکنات سے معمور نظر آتے ہیں۔ اپنے اسلوب میں انتہائی منفرد ہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص کے ساتھ انسانی وارفتگی کے نغمے گائے ہیں۔ زندگی کی قدر کرنا سکھایا ہے۔

جوشؔ ایک ایسے انسان ہیں جو خود کو انسانوں سے اوپر دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ ان کے ساتھ مل جل کر سارے واقعات وحالات کا مقابلہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ انہوں نے آزادی سے متعلق

جتنی نظمیں ہیں ہیں وہ سب کی سب آزادئ وطن کے جذبے سے سرشار ہیں اور یہی نظمیں جوش کی شخصیت کو سنوارنے میں مددگار ہیں۔ انہوں نے آزادئ وطن کے لئے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جوش کی انقلابی نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی جوش پر جذبات کا غلبہ طاری ہوجاتا ہے اور وہ جوش میں آجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی انقلابیت مجروح ہوجاتی ہے اور وہ ایک باغی شاعر کے روپ میں آکھڑے ہوتے ہیں بہرحال اردو شاعری کی دنیا میں جوش ممتاز مرتب کے حامل ہیں انہوں نے انسانیت کے لئے راہیں ہموار کیں اور حیوانیت کے خلاف اپنی نظموں کو بارود کا رنگ بخشا۔ ان کی شاعری کو محض کھوکھلی شاعری کہہ کہ ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

Faiz Ahmad Faiz ki Shairy : Ek Mutala by Dr. Shamshad Fatima
(Teacher 10+2high School,Bajoli, Darbhanga)cell-7004436223)
ڈاکٹر شمشاد فاطمہ (معلمہ +2 ہائی اسکول، بجولی، دربھنگہ)

فیض احمد فیض کی شاعری۔ایک مطالعہ

فیض احمد فیض کا تعارف: فیض احمد فیض کی شاعری کا سفر نامہ لمبا ہے۔فیض صرف محبتوں کے شاعر نہیں تھے۔اس لئے وہ کہتے ہیں:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض کے یہاں عشق کی گرمی کے ساتھ انقلاب کا جوش بھی ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ان کی شاعری میں غریبوں اور مظلوموں کی آواز بھی ہے جو جدید سرمایہ داروں کے نظام کے بیچ میں دب کے رہ گئی۔ ان کی شاعری کے کئی رنگ ہیں کبھی ان کا انداز رومانی ہوجاتا ہے تو کبھی انقلاب رومانی شاعری میں ان کا الگ ہی رنگ ہے۔بالکل منفرد علیحدہ:

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

کبھی کبھی انقلاب اور رومان کا سنگم بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے:

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن دیکھیں ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

ان کی شاعری کا یہی انداز ان کو اوروں سے الگ اور منفرد بناتا ہے۔انہوں نے ہر پہلو کو اپنے شاعری میں جگہ دی ہے۔محبت کے علاوہ بھی اور بہت ساری ضرورتیں ہیں۔اس لئے کہتے ہیں:

دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا مجھ سے دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض نے اپنی شاعری کے ذریعہ ظلم کو ظلم اور ستم کو ستم کہنے کا سلیقہ بڑی شگفتگی کے ساتھ سکھایا۔انکار کی جرأت عطا کی، مشاہدہ حق کی گفتگو میں حسن کی لطافتوں کا رنگ بھر دیا اور گفتگو کو زیادہ دو معنی، دلکش اور پر اثر بنایا۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ احتجاج کے ساتھ دعا بھی کرتے ہیں۔فیض کو یقین ہے کہ آخر کار خلق خدا کا راج ہوگا اور وہ دن بھی آئے گا جب ظلم وستم کا خاتمہ ہوگا۔حکموں کے پاؤں تلے دھرتی دھڑکے گی۔اہل حکم کے سر کے اوپر بجلی کڑکے گی اور ارض خدا کے کعبے سے سب بت اٹھوائے جائیں

گے۔فیض کو یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے:

سب تاج اچھالے جائیں گے سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا

فیض احمد فیض اپنے عشق میں ناکام ہو کر دل برداشتہ تھے۔ان کی تنہائی اور انتظار کی کیفیت کے پس پردہ یہی عنصر کارفرما ہے۔ان کا شعری مجموعہ نقش فریادی میں رومان اور حقیقت دونوں موضوع ملتے ہیں۔''نقش فریادی'' کی پہلی نظم ''خدا وہ وقت نہ لائے'' میں انتظار ہے۔جس میں وہ اپنے محبوب کو آنے والے وقت کا خوف دلاتے ہیں۔اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔جب تنہائی روح کی گہرائی میں اترتی ہے تو سارا وجود سرتاپا انتظار بن جاتا ہے۔فیض کی دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' ان کے مرکز خیال کا بہترین شاہکار ہے۔محبوب کے تغافل کے باوجود وہ اسے چاہتے ہیں اور اس کو دعا بھی دیتے ہیں۔انتظار اور تنہائی کی کیفیت کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم کے چند مصرعے پیش ہیں:

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ

فیض کی ملاقات جب کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی اس وقت رشید جہاں نے انہیں کارلس مارکس کی ایک کتاب پڑھنے کو دی۔اس کتاب نے ان پر اثر ڈالا اور وہ اشتراک ادب کے مطالعے سے سوشلزم کی طرف مائل ہوئے اور ٹریڈ یونین سے وابستہ ہوئے۔انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔اس طرح وہ سیاسی میدان میں قدم رکھے۔فیض راول پنڈی کیس کے تحت ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہوئے اور چار سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔''دست صبا''،''زنداں نامہ'' انہیں دنوں کی یادگار ہیں،انہوں نے انقلاب کے سخت اور روایتی تلخ انقلابی نعروں کو شگفتگی اور میٹھی زبان عطا کی:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے!! کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہو تو کیا کہ رکھ دی ہے ہر اک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ہندی کے مشہور ناقد وجے مہون سنگھ لکھتے ہیں کہ فیض اپنے ہم عصروں میں وہ امریکن شاعر ''پاولو نیرودا'' سے زیادہ نزدیک نظر آتے ہیں۔جو اپنی ''ٹونٹی لو پوئمس'' کے دائرے سے باہر نکل کر

کسانوں اور مزدوروں کے شاعر کہلائے۔فیض کے یہاں بھی آپ کو ہی ملے گا۔فیض اکثر حد بندیوں سے باہر نکل جاتے ہیں۔تب یہ مکمل طور پر عوام کے شاعر ہو جاتے ہیں:

بول کے لب آزاد ہیں تیرے بول زباں اب تک تیری ہے
بول کی تھوڑا وقت بہت ہے جسم وزبان کی موت سے پہلے
بول کی سچ زندہ ہے اب تک بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

فیض کی شاعری نے لوگوں کو جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ ہمیشہ دبے کچلے لوگوں کی آواز بن کر سامنے آئے اور ان کی یہی بے باکی انہیں عالمی مقام عطا کرتی ہے:

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپا کر بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

فیض احمد فیض کی پیدائش ۱۳؍جنوری ۱۹۱۱ء میں پاکستان کے سیالکوٹ میں ہوئی۔ان کی شاعری کا مجموعہ ''نقش فریادی'' منظر عام پر آیا۔ان کے والد کا نام سلطان محمد خان تھا۔ جو سیالکوٹ کے جانے مانے بیرسٹر تھے۔ پانچ بہنیں اور چار بھائی کے بیچ یہ سب سے دلارے تھے۔انہوں نے ایک انگریز خاتون Alis Jorge ایلس جارج سے شادی کر کے دہلی آ گئے۔ وہ برٹس حکومت میں انگریز فوج کا حصہ بھی بنے اور ترقی کر کے کرنل کے عہدہ تک جا پہنچے۔ جب ملک آزاد ہوا تو وہ لاہور چلے گئے۔ وہاں لیاقت علی خاں کے تختہ پلٹ سازش کے جرم میں انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۵۵ ء میں ان کو رہائی ملی۔ کچھ دنوں بعد وہ عالمی دورہ پر نکل گئے۔کئی ملکوں کا سفر کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ان کے انتقال کے بعد ان کا مجموعہ ''غبار ایام'' منظر پر آیا۔فیض احمد فیض کہیں بہت نازک مزاج نظر آتے ہیں۔تو کہیں نعرے بازی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔لیکن ان کا لہجہ ہمیشہ محبت سے لبریز رہتا ہے۔ انہوں نے قید کے زمانے میں جس موضوع اور عنوان سے نظمیں لکھیں ہیں۔ جیسے ''وطن کی پکار''، ''غریبوں کی آہیں''، ''مظلوموں کی تڑپ'' آنے والے دور کی آہٹیں یہ سب انقلابی خیالات کی علامتیں ہیں۔ جو انہوں نے نظموں میں ڈھال دیا:

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لئے جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی مصنف بھی کسے وکیل کریں کس سے مصفی چاہیں

☆☆☆

The Foundation for Success in Educational Institutions:Academic Optimism

by Dr. Shaikh Wasim & Dr. Sameena Basu

(Associate Professors, CDOE, MANUU, Hyderabad)

ڈاکٹر شیخ وسیم اور ڈاکٹر ثمینہ بسو (ایسوسی ایٹ پروفیسر، مرکز برائے فاصلاتی آن لائن تعلم، مانو، حیدرآباد)

علمی مثبتیت: تعلیمی اداروں میں کامیابی کی بنیاد

تلخیص: علمی مثبتیت ایک اہم نظریہ ہے جو طلباء کی کامیابی کو فروغ دینے اور تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ اساتذہ کی خود اعتمادی، بلند تعلیمی توقعات، اور اجتماعی اعتماد پر مبنی ہے، جو تعلیمی اداروں میں ایک مثبت اور معاون ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ اس مقالے میں علمی مثبتیت کے تصور، اس کی خصوصیات، اور تعلیمی اداروں پر اس کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں طلباء کی مشغولیت میں اضافہ، اساتذہ کے عزم و حوصلے میں بہتری، اور ایک ہم آہنگ تعلیمی ثقافت کی تشکیل شامل ہے۔

کلیدی الفاظ: علمی مثبتیت، تعلیمی کامیابی، اساتذہ کی خود اعتمادی، تعلیمی توقعات، اجتماعی اعتماد، تعلیمی ماحول، طلباء کی مشغولیت، تعلیمی ثقافت

تمہید (Introduction): تعلیم کا مقصد صرف علم کی ترسیل تک محدود نہیں بلکہ ایک مثبت اور فعال تعلیمی ماحول کی تشکیل بھی ہے جو طلباء اور اساتذہ دونوں کو کامیابی کی طرف مائل کرے۔ اس سلسلے میں "علمی مثبتیت" ایک اہم تصور کے طور پر ابھرتی ہے، جو تعلیمی اداروں میں مثبت رویوں، بلند توقعات، اور اجتماعی اعتماد کے امتزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ علمی مثبتیت اساتذہ کی کارکردگی، طلباء کی کامیابی، اور ادارے کے مجموعی تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے (Hoy, Gürol&Kerimgil, 20102018;)۔

تعلیمی ماحول میں مثبت رویوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جہاں اساتذہ اور ادارے تعلیمی کامیابی پر یقین رکھتے ہیں، وہاں طلباء کی کارکردگی میں نمایاں بہتری آتی ہے۔ مثبت تعلیمی رویے نہ صرف طلباء کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک کرنے میں مدد

دیتے ہیں بلکہ ان میں خود اعتمادی اور مستقبل کے لیے بہتر منصوبہ بندی کے جذبات کو بھی فروغ دیتے ہیں(2013Tschannen-Moran et al.,2021;Ratnawati et al.,)۔

اس مضمون کا مقصد علمی مثبتیت کے تصور کو تفصیل سے بیان کرنا اور تعلیمی اداروں میں اس کے کردار کو اجاگر کرنا ہے۔ مضمون میں اس کے بنیادی اجزاء، اثرات، اور تعلیمی کامیابی میں اس کے کردار پر روشنی ڈالی جائے گی، تاکہ اس تصور کی اہمیت کو سمجھا جا سکے اور اس کے فروغ کے لیے مؤثر حکمت عملی تجویز کی جا سکے۔

علمی مثبتیت کا تصور(Concept of Academic Optimism)

علمی مثبتیت کی تعریف: علمی مثبتیت ایک جدید تعلیمی تصور ہے جو اساتذہ، طلباء، اور تعلیمی اداروں میں موجود مثبت رویوں اور اعتماد کے امتزاج کو بیان کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو اس یقین پر مبنی ہے کہ تمام طلباء سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور تعلیمی ادارے ان کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

علمی مثبتیت کے اجزاء: اس میں تین اہم اجزاء شامل ہیں:

تعلیمی خود اعتمادی۔ اساتذہ کا اپنے تدریسی کردار پر ایسا یقین کہ وہ طلباء کی تعلیمی کارکردگی پر مثبت اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں(2006Hoy et al.,)۔

تعلیمی توقعات: تمام طلباء کی کامیابی کے لیے بلند معیار اور اہداف مقرر کرنا(Ünal, 2021)۔

اجتماعی اعتماد: تعلیمی ادارے کے تمام افراد کے درمیان باہمی اعتماد، جو مثبت ماحول کی بنیاد فراہم کرتا ہے(Yurt, 2022Lapina, 2021;)۔

نظریاتی پس منظر اور تعلیم میں اہمیت(Theoretical Background and Importance in Education): علمی مثبتیت کا نظریاتی پس منظر مثبت نفسیات اور تعلیمی سماجیات کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ تصور بیان کرتا ہے کہ مثبت رویے اور اعتماد نہ صرف تعلیمی کارکردگی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ادارے کے مجموعی ماحول کو بھی بہتر بناتے ہیں۔ تعلیم میں اس کی اہمیت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ طلباء کی کارکردگی ان کے ماحول اور اساتذہ کے رویے سے کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔ علمی مثبتیت تعلیمی اداروں کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا ماحول تخلیق کریں جہاں طلباء اور اساتذہ دونوں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر سکیں اور مشترکہ کامیابی کی راہ ہموار ہو۔

علمی مثبتیت کی خصوصیات(Characteristics of Academic Optimism)

علمی مثبتیت ایک مربوط تصور ہے جو تعلیمی اداروں میں مثبت رویوں اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ضروری خصوصیات پر زور دیتا ہے۔ اس کے تین اہم عناصر ہیں جو تعلیمی ماحول کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں:

تعلیمی خود اعتمادی: (Teacher Efficacy) تعلیمی خود اعتمادی اساتذہ کا وہ یقین ہے جو ان کی اپنی تدریسی صلاحیتوں پر اعتماد کو ظاہر کرتا ہے۔ اساتذہ اپنے طلباء کی تعلیمی کارکردگی پر مثبت اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، خواہ انہیں سماجی یا تعلیمی چیلنجز کا سامنا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ خصوصیت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ اساتذہ اپنے پیشے میں پائیدار جذبہ رکھتے ہیں اور وہ طلباء کی ترقی کے لیے نئی تدریسی حکمت عملیوں کو اپنانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

تعلیمی توقعات: (Academic Expectations) تعلیمی توقعات سے مراد یہ ہے کہ تعلیمی ادارے طلباء کی کامیابی کے لیے بلند معیار اور اہداف مقرر کریں۔ یہ خصوصیت تمام طلباء کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنے اور ان کی تعلیمی کامیابی پر یقین رکھنے کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ جب طلباء کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ان سے بلند توقعات وابستہ ہیں، تو وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے زیادہ محنت کرتے ہیں۔

اجتماعی اعتماد: (Collective Trust) اجتماعی اعتماد اساتذہ، طلباء، والدین، اور انتظامیہ کے درمیان موجود ایک مضبوط تعلق کو ظاہر کرتا ہے، جو تعلیمی ادارے کے مجموعی مشن اور مقاصد پر یقین پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اعتماد اس وقت پروان چڑھتا ہے جب تعلیمی ادارے میں شفافیت، ایمانداری، اور باہمی احترام کا ماحول ہو۔ اجتماعی اعتماد اساتذہ کو باہمی تعاون کے مواقع فراہم کرتا ہے، طلباء کو خود پر یقین رکھنے کی ترغیب دیتا ہے، اور ادارے کو تعلیمی کامیابی کے لیے متحد کرتا ہے۔ یہ تینوں عناصر علمی مثبتیت کی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں ایک مثبت، متحرک اور کامیاب تعلیمی ماحول کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ علمی مثبتیت کا تعلیمی اداروں میں اثر (Impact of Academic Optimism on Educational Institutions) علمی مثبتیت تعلیمی اداروں میں نہایت اہم اور مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ نہ صرف طلباء کی کامیابی کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ اساتذہ کی کارکردگی اور تعلیمی ماحول کو بھی بہتر بناتی ہے۔ اس کے اثرات درج ذیل ہیں:

طلباء کی کارکردگی اور مشغولیت پر اثر (Influence on Student Achievement and Engagement)

علمی مثبتیت طلباء کی تعلیمی کارکردگی اور ان کے تعلیمی عمل میں مشغول ہونے پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ بلند توقعات اور مثبت رویے طلباء میں خود اعتمادی کو فروغ دیتے ہیں۔ تعلیمی خود اعتمادی کے تحت اساتذہ طلباء کی انفرادی ضروریات کو سمجھتے ہیں اور ان کے لیے موزوں حکمت عملی اپناتے ہیں، جس سے ان کی تعلیمی مشغولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ طلباء کو چیلنجز کا سامنا کرنے اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے۔

اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور عزم میں بہتری (Improvement in Teacher Motivation and Morale): علمی مثبتیت اساتذہ کی پیشہ ورانہ زندگی میں حوصلہ افزائی اور اطمینان پیدا کرتی ہے۔ اساتذہ کا اپنے تدریسی کردار پر اعتماد انہیں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اجتماعی اعتماد کی بدولت اساتذہ کو ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھنے کے مواقع ملتے ہیں، جو ان کے تدریسی معیار کو بلند کرتے ہیں۔ اساتذہ کو ایک مثبت اور معاون ماحول میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے، جو ان کی پیشہ ورانہ ترقی کا باعث بنتا ہے۔

مثبت تعلیمی ماحول اور ثقافت کی تشکیل (Creation of a Positive School Climate and Culture): تعلیمی ادارے میں علمی مثبتیت کے نفاذ سے ایک مثبت اور معاون ماحول تشکیل پاتا ہے۔ اجتماعی اعتماد اور بلند توقعات تعلیمی ادارے کے تمام افراد کو ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد کرتے ہیں۔ طلباء، اساتذہ، اور والدین کے درمیان مضبوط تعلقات قائم ہوتے ہیں، جو ادارے کی مجموعی ترقی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسا ماحول طلباء کی جذباتی اور تعلیمی ضروریات کو پورا کرتا ہے، جس سے ان کی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

تعلیمی چیلنجز پر قابو پانے میں کردار (Role in Overcoming Educational Challenges)

علمی مثبتیت تعلیمی چیلنجز سے نمٹنے میں ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ تعلیمی خود اعتمادی اساتذہ کو ان مسائل پر قابو پانے کی ترغیب دیتی ہے جو طلباء کی کارکردگی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ اجتماعی اعتماد ادارے کو اجتماعی حکمت عملیوں کو اپنانے کی طرف راغب کرتا ہے، جو چیلنجز کا سامنا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ مثبت رویہ اور بلند توقعات تعلیمی ادارے کو ہر قسم کے رکاوٹوں کے باوجود ترقی کے راستے پر گامزن رکھتے ہیں۔ یہ اثرات علمی مثبتیت کو تعلیمی اداروں کی کامیابی کے لیے ایک لازمی عنصر ثابت کرتے ہیں اور اسے ادارے کے تمام افراد کے لیے ترقی کا ذریعہ بناتے ہیں۔

علمی مثبتیت کے فروغ کے حکمت عملیاں (Strategies for Fostering Academic Optimism)

تعلیمی اداروں میں علمی مثبتیت کو فروغ دینا ایک مسلسل عمل ہے جس کے لیے مؤثر حکمت عملیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ درج ذیل اقدامات علمی مثبتیت کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں:

پیشہ ورانہ ترقی اور اساتذہ کی تربیت: (Professional Development and Teacher Training) اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی علمی مثبتیت کے فروغ کا بنیادی عنصر ہے۔

- اساتذہ کو جدید تدریسی مہارتوں اور مثبت نفسیاتی اصولوں کی تربیت فراہم کی جائے۔
- ورکشاپس اور سیمینارز کے ذریعے اساتذہ میں تعلیمی خود اعتمادی کو بڑھایا جائے۔
- تجرباتی تدریسی طریقے اپنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ اساتذہ اپنی تدریسی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کر سکیں۔

ادارے میں تعاون اور مشترکہ وژن کو فروغ دینا (Encouraging Collaboration and Shared Vision within Schools:) تعلیمی ادارے میں باہمی تعاون علمی مثبتیت کی تعمیر میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

- اساتذہ اور انتظامیہ کو ایک مشترکہ وژن کے تحت کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔
- ٹیم ورک اور کمیونٹی میٹنگز کے ذریعے ادارے کے تمام افراد کو ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھنے کا موقع دیا جائے۔
- طلباء اور اساتذہ کے درمیان مؤثر روابط کو فروغ دیا جائے تاکہ تعلیمی ماحول میں باہمی اعتماد اور مثبت رویے پیدا ہوں۔

طلباء کے لیے بلند توقعات کا تعین اور ان کا تسلسل (Setting and Maintaining High Students Expectations for:) طلباء کی کامیابی کے لیے ان سے بلند توقعات وابستہ کرنا ضروری ہے۔

- اساتذہ اور والدین کو یہ سکھایا جائے کہ وہ طلباء کی صلاحیتوں پر اعتماد رکھیں اور ان کے لیے معیاری اہداف طے کریں۔
- تعلیمی عمل میں مثبت ردعمل کے ذریعے طلباء کو ان کے اہداف کے حصول کے لیے ترغیب دی جائے۔
- طلباء کی کامیابیوں کو تسلیم کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے انعامی نظام متعارف کرایا جائے۔

معاون اور پراعتماد کمیونٹی کی تشکیل (Building a Supportive and Trusting Community

among Staff:and Students): معاون اور پر اعتماد تعلیمی ماحول علمی مثبتیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

• اساتذہ، طلباء، اور والدین کے درمیان مضبوط تعلقات قائم کیے جائیں جو باہمی احترام اور اعتماد پر مبنی ہوں۔

• تعلیمی ادارے میں ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جہاں طلباء اور اساتذہ اپنی رائے اور خیالات کا آزادانہ اظہار کر سکیں۔

• مشکلات کے وقت تعاون اور مدد فراہم کرنے کی ثقافت کو فروغ دیا جائے تاکہ تعلیمی ادارے میں ہم آہنگی برقرار رہے۔

یہ حکمت عملیاں تعلیمی اداروں کو علمی مثبتیت کے فروغ میں معاونت فراہم کرتی ہیں اور ایک مثبت اور کامیاب تعلیمی ماحول کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

علمی مثبتیت اور تعلیمی کامیابی کا تعلق (Relationship between Academic Optimism and Educational Success): تعلیم میں کامیابی کے لیے علمی مثبتیت ایک اہم عنصر ہے جو طلباء، اساتذہ، اور تعلیمی اداروں کے رویوں اور حکمت عملیوں پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہ تصور تعلیمی کارکردگی کو بہتر بنانے اور اداروں کو طویل المدتی کامیابی کی طرف گامزن کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ طویل المدتی تعلیمی کامیابی پر اثر: علمی مثبتیت تعلیمی کامیابی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

• طلباء کے رویوں پر اثر: مثبت توقعات طلباء کو محنت، خود اعتمادی، اور تعلیمی مشغولیت میں اضافہ کرنے کی تحریک دیتی ہیں۔

• اساتذہ کی خود اعتمادی: اساتذہ کا یقین کہ وہ طلباء کی کارکردگی پر اثر ڈال سکتے ہیں، تعلیمی نتائج کو بہتر بناتا ہے اور ایک معاون تدریسی ماحول فراہم کرتا ہے۔

• اجتماعی اعتماد: ادارے میں باہمی اعتماد، ٹیم ورک، اور تعاون کے ذریعے ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا ہوتا ہے جو طویل المدتی کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔

مثبت رویے اور طلباء کی کارکردگی کا تعلق: علمی مثبتیت اور طلباء کی تعلیمی کارکردگی کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے:

• بلند توقعات کا اثر: طلباء کے لیے بلند معیار اور توقعات ان کے اعتماد اور محنت میں اضافہ کرتے ہیں۔

• مثبت ماحول: ایک حوصلہ افزا اور معاون تعلیمی ماحول طلباء کی کارکردگی کو بڑھاتا ہے۔
• سماجی اور جذباتی ترقی: مثبت رویے طلباء کو تعلیمی چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر مضبوط بناتے ہیں اور ان کے تعلیمی سفر کو ہموار کرتے ہیں۔

یہ عناصر واضح کرتے ہیں کہ علمی مثبتیت نہ صرف تعلیمی اداروں کی مجموعی کامیابی کو فروغ دیتی ہے بلکہ طلباء کے روشن مستقبل کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

چیلنجز اور مشکلات (Challenges and Obstacles): علمی مثبتیت کے فروغ میں کئی چیلنجز اور مشکلات پیش آسکتی ہیں جو اس عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ ان چیلنجز کو سمجھنا اور ان پر قابو پانے کی حکمت عملی وضع کرنا تعلیمی اداروں کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

علمی مثبتیت کے فروغ میں ممکنہ رکاوٹیں (Potential Barriers to Fostering Academic Optimism):

• منفی رویے: تعلیمی اداروں میں منفی رویے، جیسے عدم تعاون یا عدم اعتماد، علمی مثبتیت کے فروغ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔
• محدود وسائل: تعلیمی ادارے اکثر مالی وسائل یا تربیتی مواقع کی کمی کا شکار ہوتے ہیں، جو مثبت تعلیمی ماحول کی تشکیل میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔
• روایتی تدریسی طریقے: تبدیلی کی مخالفت اور روایتی تدریسی طریقوں پر اصرار، علمی مثبتیت کو نافذ کرنے کے عمل کو سست کر سکتے ہیں۔ سماجی و معاشی عوامل، اساتذہ کی تھکن، اور نظامی مسائل (Socioeconomic Factors, Teacher Burnout, and Systemic Issues)
• سماجی و معاشی عوامل: طلباء کے معاشی اور سماجی حالات علمی مثبتیت کے اثرات کو محدود کر سکتے ہیں، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں غربت اور تعلیمی عدم مساوات زیادہ ہے۔
• مسلسل دباؤ: اساتذہ کے لیے اضافی ذمہ داریاں اور مسلسل دباؤ ان کی کارکردگی اور تعلیمی خود اعتمادی کو متاثر کر سکتے ہیں۔
• نظامی مسائل: ناقص پالیسی سازی، غیر معیاری نصاب، اور ناقص انتظامی ڈھانچہ تعلیمی اداروں میں علمی مثبتیت کے فروغ میں بڑی رکاوٹیں بن سکتے ہیں۔

اداروں میں تبدیلی کی مزاحمت پر قابو پانا (Overcoming Resistance to Change within Institutions):

• مزاحمت کے اسباب: تعلیمی ادارے اکثر تبدیلی کے عمل میں مزاحمت کا سامنا کرتے ہیں، جس کی وجہ غیر یقینی کا خوف یا تبدیلی کے اثرات سے متعلق غلط فہمیاں ہوسکتی ہیں۔

• تبدیلی کا انتظام (Change Management):

o تبدیلی کے فوائد اور ان کے اثرات کے بارے میں جامع آگاہی فراہم کی جائے۔

o تمام اسٹیک ہولڈرز کو تبدیلی کے عمل میں شامل کیا جائے تاکہ انہیں ملکیت کا احساس ہو۔

o چھوٹے، قابل حصول اقدامات سے تبدیلی کا آغاز کیا جائے تاکہ ادارے بتدریج مثبت رویوں کو اپنائیں۔

• پیشہ ورانہ ترقی: اساتذہ اور عملے کی تربیت کے ذریعے ان میں تبدیلی کے عمل کو اپنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

علمی مثبتیت کے فروغ کے راستے میں چیلنجز موجود ہیں، لیکن ان کا سامنا کر کے اور ان پر قابو پا کر تعلیمی ادارے نہ صرف اپنے طلباء کے لیے ایک مثبت ماحول فراہم کر سکتے ہیں بلکہ ایک پائیدار کامیابی کی راہ بھی ہموار کر سکتے ہیں۔

سفارشات (Recommendations): علمی مثبتیت کے مؤثر نفاذ کے لیے تعلیم و تربیت سے جڑے افراد، پالیسی سازوں، اور تعلیمی اداروں کو ایک مربوط حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ درج ذیل سفارشات اس حوالے سے رہنمائی فراہم کرتی ہیں:

معلمین اور پالیسی سازوں کے لیے عملی تجاویز (Practical Suggestions for Educators and Policymakers):

• اساتذہ کو علمی مثبتیت کے نظریے اور اس کے اثرات سے آگاہ کیا جائے۔

• پیشہ ورانہ تربیت کے ذریعے اساتذہ میں تعلیمی خود اعتمادی کو فروغ دیا جائے۔

• ایسی پالیسیاں تشکیل دی جائیں جو تعلیمی اداروں میں مثبت تعلیمی رویے کے فروغ کو یقینی بنائیں۔

• تعلیمی بجٹ میں اضافہ کیا جائے تاکہ طلباء اور اساتذہ کے لیے ضروری وسائل فراہم کیے جاسکیں۔

• اسکولوں اور اساتذہ کی کارکردگی کی جانچ کے لیے ایک شفاف اور حوصلہ افزا نظام وضع کیا جائے۔

تعلیمی اداروں کے لیے سفارشات (Recommendations for Schools Optimism)

• ادارے کی پالیسیز اور وژن میں علمی مثبتیت کو مرکزی حیثیت دی جائے۔

• طلباء، اساتذہ، اور والدین کے ساتھ مل کر ایک ایسا مثبت ماحول تشکیل دیا جائے جو سب کی بھلائی پر

مرکوز ہو۔

• ادارے میں اجتماعی اعتماد کو فروغ دینے کے لیے ٹیم ورک، باہمی تعاون، اور تعلیمی سرگرمیوں کا انعقاد کیا جائے۔

• طلباء کی کامیابیوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

• انفرادی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریسی طریقے اپنائے جائیں۔

• اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص پروگرامز متعارف کروائے جائیں۔

• اساتذہ کو باقاعدہ وقفہ اور تفریح کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ تھکن کا شکار نہ ہوں۔

یہ سفارشات تعلیمی اداروں، معلمین، اور پالیسی سازوں کے لیے ایک جامع رہنما ہیں جو علمی مثبتیت کو عملی جامہ پہنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان پر عمل کر کے نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے بلکہ طلباء اور اساتذہ دونوں کے لیے ایک مثبت اور معاون تعلیمی ماحول بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔

اختتامیہ (Conclusion): علمی مثبتیت تعلیمی کامیابی اور طلباء کی کارکردگی کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے عناصر۔ تعلیمی خود اعتمادی، بلند توقعات، اور اجتماعی اعتماد۔ علیمی اداروں میں ایک مثبت اور معاون ماحول فراہم کرتے ہیں، جہاں طلباء اور اساتذہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہترین نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ اسکولوں میں علمی مثبتیت کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ اساتذہ، طلباء، اور والدین کے درمیان تعاون کو مضبوط کیا جا سکے اور تعلیمی معیار کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس کے نفاذ کے لیے پالیسی سازوں اور تعلیمی منتظمین کو مستقل توجہ اور وسائل فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ علمی مثبتیت نہ صرف تعلیمی کامیابی کی ضمانت دیتی ہے بلکہ طلباء کی ذہنی، جذباتی، اور سماجی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے، جو ان کے روشن مستقبل اور بہتر معاشرے کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نظریہ تعلیمی اداروں کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے جہاں نہ صرف طلباء کو ان کی مکمل صلاحیتوں تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ادارے بھی تعلیمی ترقی اور کامیابی کی مثال بن سکتے ہیں۔

حوالہ جات (References)

.Academic (2010) &Kerimgil, S. Gürol, M.,
Social and Behavioral Sciences, 9,_ optimism.Procedia
j.sbspro.2010.12.261/ doi.org/10.1016//:https929–932.

Theory of Academic Optimism and Student.(2018)Hoy, W.
Achievement.
nd-Student-Achievement.pdf/11/www.waynekhoy.com/wp-content/uploads/2018//:https
Academic .(2006)Hoy, A. W.&Tarter, C. J.,Hoy, W. K.,
A Force for Student Achievement.:Optimism of Schools
425–446.,(3)American Educational Research Journal, 43
00028312043003425/doi.org/10.3102//:https
Development Of Academic Optimism.(2021)Lapina, A. S.
?European ?the In The Style Of A Modern School.
Behavioural Sciences. & Proceedings of Social
epsbs.2021.12.02.64/doi.org/10.15405//:https
Academic Optimism of Schools and .(2012)Mckinnon, P.
Student Achievement Recommended Citation.
italcommons.georgiasouthern.edu/cgi/viewcontent.cgi?article=1793&context=etd//:https
&Atmoko, A. Ramli, M., Setyosari, P., Ratnawati, V.,
.Development of Academic Optimism Model in (2021)
Learning for Junior High School Students.European
1741–1753. ,(4)Journal of Educational Research, 10
eu-jer.10.4.1741/doi.org/10.12973//:https
.The(2023)Chen, Y.&Zou, X.,Han, H.,Guan, W.,Scott, T.,
Impact of Academic Optimism, Institutional Policy and
’Support, and Self-Efficacy on University Instructors
Continuous Professional Development in Mainland
215824402311533. ,(1)China.SAGE Open, 13
21582440231153339/doi.org/10.1177//:https

&Mitchell, R. M., Bankole, R. A., Tschannen?Moran, M., a :Student Academic Optimism .(2013) Moore, D. M. confirmatory factor analysis. Journal of Educational 150–175. ,(2)Administration, 51
09578231311304689/doi.org/10.1108//:https
The Relationship between Teacher .(2021) Ünal, A. :Academic Optimism and Student Academic Achievement |,A Meta-Analysis. Psycho-Educational Research Reviews 284–297. ,(2)10
files.eric.ed.gov/fulltext/EJ1311553.pdf//:https
.Academic Optimism in the Context of (2022) Yurt, E. Social Cognitive Theory.
files.eric.ed.gov/fulltext/ED631234.pdf//:https

☆☆☆

Lesani Amozish ke mutalliq nafsyati lesanyati nazaryat : Ek Tarruf

by Imtiyaz Ahmad(Asst. Prof. dept.of IASE faculty of education
Jamia Millia Islamia University(new Delhi) cell-
امتیاز احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تربیتِ اساتذہ و نیم رسمی تعلیم (آئی۔اے۔ایس۔ای۔)
فیکلٹی آف ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

لسانی آموزش کے متعلق نفسیاتی لسانیاتی نظریات: ایک تعارف

جب ہم حیات انسانی کے صدیوں پرانے سفر کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ بنی نوع انسان نے اس طویل تاریخی سفر کے دوران اپنی تخلیقی صلاحیت کے بنا پر متعدد زبانوں کی تخلیق کی ہے اور اس کے توسط سے اپنے ما فی الضمیر اور خیالات و جذبات کے موشگافیوں اور باریکیوں کو دوسروں تک پہنچایا ہے۔ زبان انسان کی تمام تخلیقات اور ایجادات میں سب سے زیادہ بیش قیمت اور گراں قدر تہذیبی سرمایہ ہے ۔ یہ حضرتِ انسان کی فکر و نظر اور تخلیقی صلاحیت کا سب سے بہترین اور عمدہ مظہر اور اس کی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ انسان زبان کی مدد سے اپنے افکار و خیالات، نظریات و تصورات، جذبات و احساسات اور میلانات و رجحانات کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی زبان رابطہ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ انسان اپنی اسی قوت گویائی اور اظہارِ ما فی الضمیر کی لیاقت کے بنا پر جانوروں سے ممتاز متصور کیا جاتا ہے اور حیوانِ ناطق اور اشرف المخلوقات کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ انسان الفاظ اور جملوں کی مدد سے اپنے خیالات و جذبات اور احساسات کو نہ صرف دوسروں تک پہنچانے پر قادر ہے بلکہ اسے تحریری شکل دے کر مستقبل کے لیے محفوظ بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا معلومات کی ترسیل، تجربات و مشاہدات کے تبادلہ اور تہذیب و ثقافت کے ابلاغ کے لیے زبان کا اچھی طرح سیکھنا نہایت ہی اہم ہو جاتا ہے۔ زبان نہ صرف انسانی ذہن کے دریچے کو وا کرتی ہے بلکہ اسے نئے خواب و خیال بننے اور فکر و نظر کو جلا بخشنے میں تعاون بھی کرتی ہے۔ زبان کی بنیادی چار مہارتیں سننا، پڑھنا، بولنا اور لکھنا لسانی آموزش و اکتساب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ بحیثیت آموزگار اور استاد ان مہارتوں کے آموزشی طریقہ ہائے تدریس اور حکمت عملیوں سے

اچھی طرح واقف ہونا از حد ضروری ہے۔نفسیاتی لسانیات زبان کی آموزش و اکتساب اور تدریسی طریقوں کی افہام وتفہیم میں اساتذہ اور طلبہ کی نہ صرف مدد کرتی ہے بلکہ ان کے جملہ مبادیات و جزئیات کی واضح تعبیر وتشریح میں ان کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔نفسیاتی لسانیات طلبہ کی لسانی آموزش کی غلطیوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ لسانی آموزش و اکتساب کو آسان بنانے میں ان کی مدد بھی کرتی ہے۔ نیز نفسیاتی لسانیات مختلف قسم کی ذہنی اور وقوفی عوارض اور اس کی اقسام کو بھی بیان کرتی ہے جو طلبہ کے اندر زبان کی نشوونما کو کافی متاثر کرتی ہیں۔ یہ مضمون لسانی آموزش کے متعلق ماہرینِ نفسیات کے مختلف نظریات پر نہ صرف روشنی ڈالتا ہے بلکہ ان نظریات کی روشنی میں چند اہم طریقہ ہائے تدریس کے تجاویز بھی پیش کرتا ہے۔

دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان واحد ایسی مخلوق ہے جسے قوت گویائی کی صلاحیت سے سرفراز کیا گیا ہے۔جس طرح اسے سماعت کے لیے کان، بصارت کے لیے آنکھ، تفکر و تدبر کے لیے دماغ اور فہم وفراست کے لیے ذہن سے نوازا گیا ہے اسی طرح خیالات وجذبات کے ارسال وترسیل کے لیے قوت گویائی سے ہمکنار کیا گیا ہے۔ انسان مواصلات، اپنے خیالات و جذبات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے جن صوتی اور لفظی وسائل کا استعمال کرتا ہے، اسے زبان کہا جاتا ہے۔زبان نہ صرف انسانی ذہن کو وسعت دیتی ہے بلکہ نئے خوابوں کو بننے اور اس کی تعبیر پانے میں رہنمائی بھی کرتی ہے۔زبان ہی کے توسط سے مکاتب و مدارس اور اسکولز و کالجز کے اندر درس و تدریس کے امور جاری وساری رہتے ہیں۔مشہور فلسفی جان اسٹورٹ مل نے زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''زبان دماغ کی روشنی ہے۔'' دماغ کو جلا بخشنے اور فکر ونظر کو سمت و رفتار عطا کرنے کے لیے زبان کی جملہ اوصاف، مبادیات و جزئیات اور رسمیات سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔زبان سادہ و عام فہم معنی میں جتنی آسان معلوم ہوتی ہے، اس کی آموزش اتنی ہی زیادہ دشوار نظر آتی ہے۔نفسیاتی لسانیات انسانی وقوف اور زبان کے درمیان رونما ہونے والے تمام مسائل کی نہ صرف وضاحت کرتی ہے بلکہ ان مسائل کو حل کرنے میں رہنمائی بھی کرتی ہے۔ یہ شعبۂ علم دو مختلف شعبوں یعنی نفسیات اور لسانیات پر مشتمل ہے۔نفسیات جہاں انسانی ذہن و دماغ کے افعال و اعمال اور وقوفی نظام کے جملہ گوشوں کو طشت از بام کرتی ہے وہیں لسانیات زبان کے برتاؤ و کردار سے بحث کرتی ہے۔لہٰذا نفسیاتی لسانیات ایک ایسا شعبۂ علم ہے جو زبان اور انسانی ذہن کے مطالعہ کو زیر بحث لاتا ہے۔مختلف ماہرین نے نفسیاتی لسانیات کے متعدد نظریات پیش کئے ہیں۔ یہ تمام نظریات

اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک بچہ کس طرح زبان کو حاصل کرتا یا سیکھتا ہے، اپنے اندر لسانی مہارت کیسے پیدا کرتا ہے اور اس کے ذہن کی قوت یا کمزوری اظہارِ مافی الضمیر اور ترسیل و ابلاغ کی صلاحیت پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟۔عصر حاضر میں زبان کے درس و تدریس میں ان نظریات کا بخوبی استعمال کیا جاتا ہے۔نفسیاتی نقطہ نظر طلبہ کی انفرادی آموزش کے عمل کو دیکھتا ہے جبکہ لسانیاتی نقطہ نظر زبان سیکھنے میں ہونے والی غلطیوں کی وضاحت کرتا ہے۔نفسیاتی لسانیات طلبہ میں موجود کچھ ایسی دماغی عوارض کو بھی زیرِ بحث لاتی ہے جو نفسیاتی طور پر طلبہ کی آموزشی کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں۔ نفسیاتی لسانیات بنیادی طور پر زبان کے چھ مبادیات کو اپنا موضوعِ بحث بناتی ہے اور انہی کی توضیح و تشریح پر زور دیتا ہے۔ان چھ مبادیات میں لسانی تعامل، لسانی ذخیرہ اور اس تک رسائی، نظریۂ تفہیم، زبان اور دماغ، غیر معمولی حالات میں زبان کی آموزش، اور آموزشِ زبانِ اول شامل ہیں۔

لسانی آموزش کے متعلق نوم چامسکی کا وقوفی نظریہ: امریکی ماہر لسانیات اور بیسویں صدی کا سب سے معروف فلسفی نوم چامسکی نے لسانیات، سیاسیات اور ذرائع ابلاغ جیسے موضوعات پر تقریباً ایک سو سے زیادہ مضامین لکھا ہے۔انھوں نے زبان کی حیاتیاتی اساس کو بنیاد بناتے ہوئے لسانی آموزش کے متعلق اپنے نظریات و تصورات کا اظہار کیا ہے۔چامسکی کے مطابق بچہ لسانی آموزش کے آلہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جو لسانی تحصیلی آلہ کے نام موسوم ہے۔یہ لسانی تحصیلی آلہ انسانی دماغ کے لاکھوں کروڑوں عملیات کی تشریح و توضیح اور زبان کی آموزش و اکتساب اور افہام و تفہیم کی صلاحیت پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔چامسکی کے مطابق بچہ اپنے گردونواح کی زبان کو نہ صرف نقل کرتا ہے بلکہ وہ اس زبان کی قواعد کو بھی اخذ کرتا ہے۔زبان سیکھ رہے چھوٹے بچے عام طور پر اپنے والدین اور گھر والوں کی باتیں سنتے وقت لاشعوری طور پر یہ پہچان لیتا ہے کہ زبان کس طرح کام رہی ہے۔اور پھر وہ بھی اسی طرح کوشش کر کے زبان سیکھتا چلا جاتا ہے۔بحیثیت انسان بچہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے زبان کے استعمال پر مجبور ہوتا ہے۔لہٰذا رسمی زبان کی عدم موجودگی میں وہ اپنے ضروریات کے لیے مواصلات کا ایک نیا نظام تیار کرتا ہے۔نوم چامسکی اس بات کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ زبان کے قواعد بہت ہی پیچیدہ اور گنجلک ہیں پھر بھی بچے اسے متواتر سن کر بڑی آسانی سے سیکھ اور سمجھ لیتے ہیں۔نوم چامسکی نے اپنے نظریہ میں اس بات کو بھی اجاگر کیا ہے کہ زبان سیکھ رہے بچے جب بولنا شروع کرتے ہیں تو وہ غلطیاں نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھ رکھتے ہیں کہ سبھی جملوں کی ساخت ایک جیسی ہوتی ہے جس میں فاعل، فعل اور مفعول ہوتے ہیں۔چامسکی نے اپنی اسی توضیح کی روشنی میں

آفاقی قواعد کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام انسانی زبانوں میں قواعد کے کچھ اصول یکساں ہیں لہذا لسانی آموزش اور مہارت کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے ان اصولوں کی پابندی اور لحاظ نہایت ضروری ہے۔ اصولوں کی عدم پابندی کی صورت میں نہ تو زبان کی آموزش ہوسکتی ہے اور نہ ہی بچوں میں لسانی مہارتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ نوم چومسکی کے لسانی آموزش کا نظریہ بالخصوص آفاقی قواعد اور فطری زبان کا تصور زبان کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اساتذہ کو دورانِ تدریس درج ذیل نکات کو مرتکزِ فکر وخیال رکھنا چاہیے۔

فطری ساخت پر توجہ: چومسکی کا لسانی آموزش کا نظریہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انسان لسانی تحصیل کی فطری صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کو زبان کی تدریس کے دوران بچوں کی فطری صلاحیت کی تشخیص کرنا چاہیے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

فطری قواعد پر توجہ: چومسکی کا نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان زبان کو سمجھنے اور تخلیق کرنے کی فطری صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ انسان بغیر کسی ہدایت اور رہنمائی کے زبان کے قواعد اور اصول سیکھنے کا رجحان اور صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کو کمرۂ جماعت میں ایک ایسا ماحول بنانا چاہیے جو طلبہ کو زبان کے استعمال اور تلاش وجستجو پر ابھارے نہ کہ قواعد کو رٹنے اور اسے ازبر کرنے پر

بامعنی مواصلات پر زور: چومسکی کا نظریہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ جب سیکھنے والے بامعنی مواصلات میں مصروف ہوتے ہیں تو زبان سیکھنا سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اساتذہ طلبہ کو حقیقی زندگی کے سیاق وسباق میں زبان کا استعمال کرتے ہوئے مواصلات کے مواقع جیسے بات چیت، مباحثے اور باہمی تعاون کی سرگرمیوں کے ذریعے لسانی آموزش کو آسان بنا سکتے ہیں۔

لسانی تغیر کا احترام: چومسکی کا نظریہ زبانوں اور بولیوں میں لسانی تغیرات کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اساتذہ کو ان تغیرات کو پہچاننا اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور کمرۂ جماعت میں ایک ایسا جامع ماحول قائم کرنا چاہیے جہاں مختلف لسانی پس منظر سے آئے طلبہ اپنے آپ کو محترم اور معزز محسوس کریں۔

معلومات اور تعامل کا کردار: چومسکی نے تحصیلِ زبان میں لسانی معلومات کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اساتذہ مستند متن، مباحثے، اور ملٹی میڈیا وسائل کے ذریعے زبان کی تحصیل کے لیے بامعنی اور متنوع معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔ زبان کی تحصیل اور اخذِ معنی میں ساتھی طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ تعامل بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے لہٰذا اساتذہ کو اس پر بھی توجہ دینا چاہیے۔

لسانی آموزش کا کلیدی دور: چومسکی کا نظریہ لسانی آموزش کے لیے ابتدائی بچپن کے دور کو بہت اہم

تسلیم کرتا ہے۔ ابتدائی بچپن میں بچے زبان کی تحصیل زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کمرۂ جماعت میں ایک ایسا سازگار اور بامعنی ماحول قائم کرنا چاہیے جہاں بچے زیادہ سے زیادہ لسانی آموزش کر سکیں۔

زبان کی تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی: چومسکی کا نظریہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ لسانی آموزش ایک تخلیقی اور مسلسل ارتقا پذیر عمل ہے۔ لہٰذا اساتذہ طلبہ کو لسانی کھیل، لسانی تجربہ اور لسانی سرگرمیوں کے مواقع فراہم کر کے انہیں زبان کی تخلیقی صلاحیتوں اور مہارتوں کے حصول پر ابھار سکتے ہیں۔ اساتذہ کا یہ طریقہ کار طلبہ میں لسانی آموزش کے مثبت رویے کے فروغ اور لسانی آموزش کے عمل میں فعال شراکت کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔

وقوفی نشوونما: چومسکی لسانی آموزش اور وقوفی نشوونما کو ایک دوسرے سے منسلک اور مربوط قرار دیتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کی وقوفی نشوونما اور اس کی صلاحیتوں کے ارتقا میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو لسانی سرگرمیوں پر مبنی ایسے مواقع فراہم کریں جو ان میں تنقیدی سوچ، حلِ مسائل اور تجزیاتی مہارتوں کو فروغ دیں۔

تدریسی طریقے: چومسکی کا نظریہ اساتذہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ ایسے طریقہ ہائے تدریس اختیار کریں جو لسانی آموزش کے فطری عمل کو تقویت دیتے ہوں۔ ان طریقہ کار میں مواصلات اساس تدریسِ زبان، سرگرمی اساس تدریس اور تجرباتی تدریس شامل ہیں جو زبان کے مستند اور بامعنی استعمال کو مستحکم کرتے ہیں اور لسانی آموزش کے دوران طلبہ میں حوصلہ افزائی اور مشغولیت کو فروغ دیتے ہوئے زبان کی عملی مہارتوں کے اکتساب میں مدد کرتے ہیں۔

لسانی آموزش کے متعلق جین پیاجے کا وقوفی نظریہ: ماہر نفسیات اور وقوفی نقطہ نظر کے بنیاد گزار جین پیاجے نے اپنی مشہور کتاب The Language and Thought of The Child میں لسانی آموزش اور بچوں کے افعال و اعمال پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق بچہ بنیادی عملی اسکیموں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے یعنی بچہ دنیا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے عملی اسکیموں کا استعمال کرتا ہے۔ جین پیاجے بچوں کی زبان کے دو افعال خودمختاری اور معاشرتی فکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حسی حرکی عہد کے دوران بچوں کے زبان میں خودمختاری اور معاشرتی فکر فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس دور میں یا تو وہ اپنے تئیں بات کرتے ہیں یا اپنے اردگرد کی ان سرگرمیوں کو خود سے منسلک کرتے ہیں جو انہیں خوشی اور مسرت بہم پہنچاتی ہیں۔ اس طرح بچے ماحول

کے ساتھ تعامل کے ذریعہ زبان سیکھتے ہیں اور دنیا کے بارے میں اپنی سمجھ پیدا کرتے ہیں۔ پیاجے کا نظریہ اس بات کی غماز ہے کہ بچے کی زبان اس کی قوتِ فکر اور استدلال کی مہارت کو فروغ دیتی ہے۔ پیاجے کا یہ نظریہ ان کے انسانی ارتقا کے وقوفی نظریہ کے چاروں مراحل سے مستنبط ہے۔ اس نظریے کے مطابق بچے اپنے ان چاروں مراحل کے ہر مدارج میں زبان کی آموزش اور تحصیل مختلف طرح سے کرتے ہیں۔ بچے حسی حرکی دور میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور جملے بولنے کی کوشش کرتے ہیں، قبل از تفاعلی دور میں بہت تیزی سے زبان کی آموزش اور اکتساب کرتے ہیں اور الفاظ و جملوں کو اپنے ذہنی اسکیما میں محفوظ کر لیتے ہیں جبکہ مقرونی دور میں اپنی تخلیقی و تنقیدی سوچ اور حلّ مسائل کی صلاحیت سے جملوں کی ترتیب و تنظیم اور اخذِ معنی کرتے ہیں۔

لسانی آموزش کے متعلق بی۔ ایف۔ اسکینر کا عاملی التزام کا نظریہ: امریکی فلاسفر اور ماہر نفسیات برہس فریڈرک اسکینر نے انسانی برتاؤ اور تعامل کے متعلق واٹسن اور پاولو کے تجرباتی تحقیقات سے متاثر ہو کر ایک تجرباتی تحقیق پیش کیا۔ اسکینر نے انسانی برتاؤ کو سمجھنے کے لیے اس کے وجوہات اور محرکات پر زیادہ توجہ صرف کرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ انہوں نے برتاؤ کے وجوہات کو تقویت کے نام سے موسوم کیا ہے جبکہ اپنے اس نظریہ کو عاملی التزام کا نام دیا ہے۔ اسکینر کے مطابق بچہ عاملی التزام کے ذریعے زبان کی آموزش کرتا ہے۔ ان کے مطابق بچہ اپنے والدین اور گردونواح کے افراد کی زبان کو نقل کرتا ہے اور اپنی اس کوشش میں یا تو کامیاب ہوتا ہے یا ناکام۔ کامیابی کی صورت میں بچہ بولے جانے والے الفاظ اور جملوں کو پہچان لیتا ہے اور دوبارہ برتاؤ اور عمل پر متحرک ہوتا ہے جبکہ ناکامی کی صورت میں دوبارہ کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ہر کامیاب کوشش پر ملے انعام و حوصلہ سے بچے کو تقویت ملتی ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر بچوں نے عملی طور پر زبان کا درست استعمال کیا ہے تو انہیں انعامات دیے جاتے ہیں جو ان کے لیے تقویت کا کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر زبان کی آموزش کے دوران ایک بچے کو اسم کی تفہیم میں مسئلہ درپیش ہے۔ بچے کے اندر اس مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے جو سابقہ کا کام دیتی ہے۔ بچہ مسئلہ کو حل کر لیتا ہے یہ عمل برتاؤ ہے، کامیابی اس مسئلہ کا نتیجہ ہے جو اسے مزید عمل کرنے کے لیے تحریک دیتی اور اکساتی ہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک بچہ مسئلہ پر پوری دسترس حاصل نہیں کر لیتا ہے۔ مسئلہ کو کامیابی سے حل نہ کرنے کی صورت میں برتاؤ کمزور ہو جاتا ہے۔ اسکینر نے اس مسئلہ سے بچنے کے لیے دو نتائج کا ذکر کیا ہے جو برتاؤ کو تقویت دیتے ہیں۔ ایک تقویت اور دوسرا سزا۔ تقویت بچے کے برتاؤ

میں مضبوطی لاتی ہے اور ماحصل کو کامیاب بناتی ہے۔تقویت دو طرح کی ہیں؛ایک مثبت اور دوسرا منفی ۔مثبت تقویت اس وقت دی جاتی ہے جب برتاؤ کوئی نئی محرکہ و مہیج پیدا کرتا ہے جبکہ منفی تقویت اس وقت پیش کی جاتی ہے جب بچہ کسی عمل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔بی۔ایف۔اسکینر کے اس نظریے کے مطابق لسانی آموزش اور تحصیل کے لیے آموزش کے ماحولیاتی اثرات، برتاؤ اور برتاؤ کے نتائج یعنی مثبت تقویت اور منفی تقویت بہت اہم رول ادا کرتے ہیں ۔لہٰذا بچوں میں لسانی آموزش اور تحصیل کے جذبات اور لگن ابھارنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی اور ترغیب بہت ضروری ہوجاتا ہے۔یہ حوصلہ افزائی اور تحریک بچے کے ردعمل اور اس کے محرکات کو تقویت دیتی ہے اور اس کے سیکھنے کے عمل کو تقویت پہنچاتی ہے۔

لسانی آموزش کے متعلق اسٹیون آرتھر پنکر کا فطری زبان کا نظریہ: کناڈا نژاد امریکی ماہرِ نفسیات اسٹیون آرتھر پنکر کا شمار بیسویں صدی کے ربعِ آخر اور اکیسویں صدی کے ممتاز ترین ماہرینِ نفسیات اور لسانیات میں ہوتا ہے۔یہ ہارورڈ یونیورسیٹی کے شعبۂ نفسیات میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ارتقائی اور تجرباتی نفسیات، وقوفی سائنس، نفسیاتی لسانیات اور مرئی وقوف ان کا خاص میدان ہیں۔ پنکر انسانی دماغ کو معلوماتی عمل کا استعارہ قرار دیتے ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب 'Language Learnability and Language Development'، 'Learnability and The Acquisition of Argument Structure:Cognition' اور 'The Blank Slate' میں لسانی آموزش اور تحصیل کی نوعیت، طریقہ کار اور مراحل پر سیر حاصل گفتگو کی ہیں۔ انہوں نے اپنی ان کتابوں اور دیگر تحقیقی مضامین کی روشنی میں بچوں کی لسانی آموزش کو سمجھنے کے لیے تخمینی آموزش کا نظریہ پیش کیا۔پنکر اپنے نظریہ میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان حیاتیاتی طور پر لسانی آموزش اور تحصیل کے لیے تیار ہے اور یہ کہ زبان کا حصول خالصتاً ماحولیاتی تربیت و پرورش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری لسانی فیکلٹی یعنی فطرت کا نتیجہ ہے۔ان کے مطابق لسانی آموزش اور تحصیل ایک ارتقائی عمل ہے اور زبان ایک خداداد شے ہے جو انسانی ذہن میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔انسان جب اپنے ماحول اور گرد و نواح کے ساتھ تعامل کرتا ہے تو لسانی آموزش کا عمل خود بہ خود شروع ہوجاتا ہے۔وہ ماحول سے حاصل شدہ لسانی معلومات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور دلیل دیتے ہیں کہ زبان کی نمائش بچوں کو ان کی فطری لسانی صلاحیتوں کو نکھارنے اور ترقی دینے میں مدد دیتی ہے۔اسٹیون پنکر اپنی مشہور کتاب 'دی بلینک سلیٹ' میں لکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو بھی انسان

ترقی کرتا ہے، وہ اپنے تجربات کے بنیاد پر کرتا ہے جو کہ اس کے ثقافت و معاشرے اور دماغ کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات میں سبھی لوگ ایک جیسے دماغ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور ان سب میں سیکھنے کی صلاحیت بھی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ لہذا زبان سیکھنے کی صلاحیت بھی سب میں ایک جیسی ہی ہوگی۔

اسٹیون پنکر کا لسانی آموزش کے نظریہ کے اہم نکات:

فطری زبان کی صلاحیت کی شناخت: پنکر کا نظریہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ بچوں میں لسانی آموزش کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ اساتذہ زبان کی اس فطری پن کو مدنظر رکھتے ہوئے کمرۂ جماعت میں ایک ایسا سازگار ماحول قائم کر سکتے ہیں جہاں لسانی آموزش اور تحصیل کے مواقع زیادہ سے زیادہ میسر ہوں اور طلبہ اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ تحصیل زبان پر قادر ہوں۔

آفاقی قواعد کے اصولوں پر توجہ: نوم چامسکی کی طرح پنکر بھی آفاقی قواعد کا تصور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمام زبانوں میں قواعد کے بنیادی اصول مشترک ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو ان آفاقی اصولوں کو پڑھانے پر زور دینا چاہیے۔ جیسے جملے کی ساخت، زمانہ، اور اقسام وغیرہ، جو طلبہ کو مختلف زبانوں میں نافذ ہونے والے بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں مدد فراہم کر سکتا ہے۔

زبان کے ابتدائی تعامل کی اہمیت: پنکر بچوں کی ابتدائی عمر کے دور کو لسانی آموزش کے لیے بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زبان کا جلد از جلد اظہار بہت ضروری ہے۔ اساتذہ کو کمرۂ جماعت میں لسانی آموزش کے لیے ایک سازگار اور پر لطف ماحول تخلیق کرنا چاہیے جس سے بچوں کو مختلف الفاظ، قواعد کی ساخت اور زبان کے افعال سے روشناس ہونے کا موقع میسر ہو۔

لسانی معلومات اور تعامل کا فروغ: پنکر جہاں زبان کی فطری صلاحیتوں کے کردار کو تسلیم کرتا ہے، وہیں وہ ماحول سے لسانی معلومات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ اساتذہ طلبہ کے درمیان باہمی تعامل، بحث و مباحثہ اور باہمی تعاون سے سیکھنے کی سرگرمیوں کے مواقع فراہم کر کے لسانی آموزش کو فروغ دے سکتے ہیں۔

لسانی نشوونما کا فروغ: پنکر کا نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ لسانی نشوونما ان مراحل سے گزرتی ہے جو وقوفی پختگی کی عکاسی کرتی ہے۔ اساتذہ کے لسانی آموزش کو یقینی بناتے ہوئے نصاب، طریقۂ تدریس اور تدریسی حکمت عملیوں کو اس انداز میں تشکیل دے سکتے ہیں جو ان ترقیاتی مراحل سے ہم آہنگ ہوں۔

لسانی آموزش میں انفرادی تفاوت کا خیال: پنکر کا نظریہ اس بات کی غماز ہے کہ لسانی آموزش اور تحصیل میں ہر طالب علم کے طریقہ کار میں انفرادی فرق اور تفاوت ہوتا ہے۔ کچھ طلبہ بہت جلد زبان حاصل کر لیتا ہے جبکہ کچھ بہت تاخیر سے تحصیلِ زبان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کو ان انفرادی تفاوت اور ضروریات کی بنیاد پر مختلف طریقہ تدریس اور حکمتِ عملیوں کو بروئے کار لانا چاہیے تا کہ ہر ایک طالب علم لسانی آموزش پر قادر ہو سکے۔

ٹیکنالوجی اور ملٹی میڈیا اساس آموزشی آلات کا انضمام: عصرِ حاضر میں درس و تدریس اور آموزش و اکتساب کے لیے مختلف طرح کے ٹیکنالوجی اور ملٹی میڈیا اساس آلات کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ یہ جدید آلات مثلاً سمعی آلات، بصری آلات، سمعی و بصری آلات اور بین تعاملی آلات زبان کی تحصیل میں نہ صرف کمرۂ جماعت کو موثر اور پر لطف بناتے ہیں بلکہ لسانی مہارتوں کی آموزش اور تحصیل میں معاون بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو ان ڈیجیٹل آلات اور ذرائع کے استعمال کے ذریعے لسانی آموزش کو دلچسپ اور پر لطف بنانا چاہیے اور لسانی مہارتوں کے حصول کو یقینی بنانا چاہیے۔

تدریسِ زبان کے طریقہ کار: پنکر کا نظریہ اس بات کی پرزور وکالت کرتا ہے کہ اساتذہ تدریسِ زبان کے روایتی طریقوں کا تنقیدی جائزہ لیں اور محض یادداشت اور مشقوں پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے ایسے مؤثر مواصلاتی اور تعاملاتی تدریسی طریقوں کو اختیار کریں جو فعال مشغولیت اور زبان کے مستند استعمال کو فروغ دیتے ہوں۔

لسانی آموزش کے طریقہ ہائے تدریس: مختلف ماہر نفسیات نے لسانی آموزش کے لیے اپنا الگ الگ نظریات پیش کئے ہیں جو اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ایک بچہ کس طرح تقریری اور تحریری سیاق و سباق میں زبان حاصل کرتا ہے۔ ان ماہرین کے نظریات کو آج بھی زبان کے درس و تدریس میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ زبان کی درس و تدریس کا نقطہ نظر لسانی ہے۔ اگر اس کے ضروری تصورات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو زبان کے درس و تدریس کے صحیح طریقے کو بھی مکمل طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ زبان کی تدریس کے طریقہ کار کی ترقی میں تین بنیادی نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں جن کو حسب ذیل طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ساختیاتی نظریہ: ساختیاتی نظریہ کی پیروی کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ زبان کی تدریس میں جملوں کی بناوٹ اور ان کی ساخت پر زیادہ توجہ مرکوز رکھنا چاہیے تا کہ بچوں کو تحصیلِ زبان میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس نظریہ کے مطابق بچوں کو پہلے قواعدی نظام سمجھانا چاہیے اس کے بعد ہی جملہ کی

ترکیب وتشکیل پڑھانا چاہیے۔

تفاعلی نظریہ: تفاعلی نظریہ کے حامی ماہرین کا یہ ماننا ہے کہ زبان ہمارے کام کے رابطے کا ذریعہ ہے، جیسے معلومات، جذبات اور یقین۔ لہٰذا زبان کی تدریس اسی نقطۂ نظر سے کرنی چاہیے۔

تعاملی نظریہ: تعاملی نظریہ کے قائل افراد کا یہ تصور ہے کہ زبان کو معاشرے اور افراد کے درمیان باہمی تعلقات اور سماجی لین دین کے لحاظ سے دیکھتا ہے اور زبان کے اساتذہ کو اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں درس وتدریس انجام دینے کی وکالت کرتے ہیں۔ نفسیاتی لسانیاتی نظریات تدریسِ زبان کے لیے کچھ بنیادی اور اہم طریقۂ تدریس اور حکمت عملیوں کی تجاویز پیش کرتے ہیں اور اس بات کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ کون سا طریقہ لسانی آموزش کے لیے بہتر اور مؤثر ہے اور لسانی مہارتوں کے حصول کے لیے کون کون سی شرائط ہیں۔ نفسیاتی لسانیات لسانی آموزش کے لیے درج ذیل اصولوں پر زور دیتی ہے۔ لسانی مہارت کا انحصار فطری ماحول میں زبان سیکھنے پر ہوتا ہے۔ نظریۂ تفہیم ساختی کام سے زیادہ ضروری ہے۔ زبان کی تعلیم مواصلاتی مہارتوں کو بہتر بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔ تدریسِ زبان اور لسانی آموزش کے جدید طریقہ ہائے تدریس:

کل جسمانی ردِّعمل کا طریقہ: امریکی ماہرِ نفسیات جیمس جے۔ ایشر نے تدریسِ زبان کے لیے کل جسمانی ردِّعمل کا نظریہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ارتقائی نفسیات، آموزشی نظریات اور انسانیت مرکوز طریقۂ تدریس کے مطالعے اور تجزیہ کے بعد یہ طریقہ تجویز کیا ہے۔ یہ طریقہ نفسیاتی نقطۂ نظر کی روشنی میں لسانی آموزش کے مندرجہ ذیل نکات اور حکمت عملیوں کی وکالت کرتا ہے۔

حسّی حرکی نظام: زبان کی تعلیم وتدریس میں اس نظام کی شمولیت سے بچے لسانی آموزش اور تحصیل بہتر طریقے سے کر پاتے ہیں۔ یہ حکمت عملی ان میں مختلف لسانی مہارتوں اور قابلیتوں کو فروغ دیتی ہے۔ ایشر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طلبہ میں تقریری صلاحیت پیدا کرنے کے بجائے ان میں زبان کی سمجھ پیدا کرنا چاہیے۔

حرکی نظریہ: یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کمرۂ جماعت میں لسانی سرگرمیوں کے استعمال کے ساتھ جسمانی حرکات وسکنات کو بھی عمل میں لانا چاہیے۔ طلبہ زبانی اور جسمانی تعامل کے ذریعے زبان کی آموزش باآسانی کر لیتے ہیں اور جسمانی اظہار کے توسط سے الفاظ کے معانی بھی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر اساتذہ دورانِ تدریس اس حکمت عملی کو مؤثر طریقے سے اپنائیں گے تو طلبہ کے لیے لسانی آموزش کا عمل بہت سہل اور آسان ہو جائے گا۔ یہ حکمت عملی بچوں اور بالغوں دونوں طرح کے

آموزگار کو زبان سیکھانے کے لیے عملی میں لائی جاسکتی ہے۔اس طریقے میں الفاظ کے معانی ومفاہیم سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کیونکہ الفاظ کے معانی جسمانی سرگرمیوں کے ذریعے سمجھائے جاتے ہیں۔

فطری طریقہ: امریکی ماہرِ نفسیات اور تعلیم ٹریسی ٹریل نے لسانی آموزش کے لیے فطری طریقہ کو متعارف کیا۔ٹریل اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان فطری ماحول اور طریقے سے زبان سیکھتا ہے اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔نفسیاتی نظریات اور اصول بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ فطری ماحول طلبہ کی لسانی آموزش کے عمل کو متاثر کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے۔بچہ اپنی مادری زبان کو بار بار سن کر فطری طور پر سمجھنے اور بولنے لگتا ہے اور اس فطری ماحول اور طریقہ کی وجہ سے اپنی مشکلات کو بذاتِ خود حل کرنے لگتا ہے۔اس میں ملنے والی کامیابی لسانی آموزش اور تحصیل کے لیے تقویت کا کام کرتی ہے۔اس فطری ماحول کا مقصد طلبہ کی لسانی آموزشی صلاحیت اور مہارت کو فروغ دینا ہے۔اس طریقے کی اہم خوبی یہ ہے کہ طلبہ کی کامیاب کوشش پر انہیں تقویت اور حوصلہ ملتا ہے جو لسانی آموزش کے عمل کو مزید بہتر اور مؤثر بناتا ہے۔

سجسٹو پیڈیا: بلغاریہ کے ماہرِ نفسیات گارگی لژینوو نے تدریسِ زبان اور لسانی آموزش کے لیے مشورہ وتجویز پر مبنی ایک جدید طریقہ متعارف کیا جو سجسٹو پیڈیا کے نام سے معروف ہے۔لژینوو نے اپنے اس طریقہ کے تحت لسانی آموزش کے لیے درج ذیل نکات اور اصولوں کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے۔لسانی آموزش کے لیے طلبہ کو ایک پرسکون ماحول دیا جانا چاہیے تاکہ وہ زبان سیکھنے کے لیے متحرک ہوں۔لسانی آموزش کا سبق شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو دماغی اور جسمانی طور پر پرسکون کرنا چاہیے تاکہ وہ تحصیلِ زبان کے لیے ہمہ تن تیار ہوں۔لسانی آموزش کے عمل کو سازگار اور مؤثر بنانے کے لیے کمرۂ جماعت میں مدھم روشنی، آرام دہ نشستوں اور مسرت انگیز موسیقی کا انتظام کرنا چاہیے۔اساتذہ کو لسانی آموزش کے دوران طلبہ میں مثبت رویہ، اعتماد اور خودمختاری کے احساسات پیدا کرنا چاہیے۔لسانی آموزش کا مواد معنی خیز اور پرلطف ہو اور مندرجہ ذیل خصوصیات پر مشتمل ہو۔مکالمہ الفاظ اور مواد پر زور دیتا ہو۔مکالمہ حقیقی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔مکالمہ عملی افادیت رکھتا ہو۔مکالمہ طلبہ کے جذبات سے متعلق ہو۔

ماحصل: نفسیاتی لسانیاتی نظریات لسانی آموزش کے مؤثر عمل آوری وفروغ اور طریقہئ تدریس و حکمت عملیوں کی مؤثریت کے لیے اساتذہ کو ایک مضبوط لائحہ عمل عطا کرتا ہے۔اساتذہ ان نظریات

کو اپنی تدریسی طریقہ کار کا جز لاینفک بنا کر لسانی کمزور جماعت کو پر لطف، زبان کی آموزش و اکتساب کو یقینی اور طلبہ میں لسانی مہارتوں کے حصول کو مؤثر اور معنی خیز بنا سکتے ہیں۔ اساتذہ دورانِ تدریس طلبہ کی انفرادی تفاوت کا خیال رکھتے ہوئے، موزوں و پر لطف سرگرمیوں پر ابھارتے ہوئے اور تعمیری و تنقیدی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے طلبہ کی لسانی آموزش کو مزید فروغ دے سکتے ہیں۔ مزید برآں، اساتذہ زبان کے متوازن معلومات و نتائج، مستند سیاق و سباق اور زبان کی ساخت کی واضح تعلیم کے ذریعے طلبہ کی آموزشی سمت و رفتار کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ زبان کے درس و تدریس اور آموزش و اکتساب میں نفسیاتی لسانیاتی اصولوں کا نفاذ نہ صرف طلبہ کو لسانی مہارتوں کے حصول میں مدد فراہم کرتا ہے بلکہ ان میں تنقیدی سوچ، تخیلاتی فکر، ثقافتی آگاہی، آپسی تعامل اور مواصلاتی صلاحیتوں کو بھی فروغ دیتا ہے۔ لہٰذا زبان کے اساتذہ کے لیے جس قدر اپنی موضوعی زبان کے مبادیات و جزئیات سے کماحقہ واقف ہونا ضروری ہے اسی قدر زبان کی آموزشی نظریات، تدریسی طریقوں اور حکمت عملیوں سے باخبر ہونا بھی لازم ہے۔

حوالہ جات

ڈاکٹر طلعت عزیز، تعلیمی نفسیات، قومی کونسل برائے فروغِ زبانِ اردو، نئی دہلی، 2015

علی رفاد فتیحی، نوم چامسکی (ایک تعارف)، قومی کونسل برائے فروغِ زبانِ اردو، نئی دہلی، 2023

رؤف پاریکھ، لسانیات کے بنیادی مباحث، نوید اسکوائر اردو بازار، کراچی، 2021

ڈاکٹر آفاق ندیم خاں، سید معاذ حسین، تعلیمی نفسیات کے پہلو، ضیا بک ڈپو، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2022

Lightbown, M. Patsy and Spada N. *How Languages Are Learned.* Oxford: Oxford University Press, United Kingdom, 2006.

Pinker, A, S. *Language Learnability and Language Development.* Harvard: Harvard University Press, United Kingdom, 1996.

Celik, I, T., Cay, T., and Kanadli, S. The Effect of Total Physical Response Method on Vocabulary Learning/Teaching: A Mixed Research Synthesis. *English Language Teaching, Vol. 14,* No.12, 2021.

English Journal for Teaching and. Total Physical Response. S,Rambe 1, 2019..No , *7. Vol,Learning*

Jadeedyat ki Fikri Jaden: Chand Mabahis by Dr. MD Sajid Alam

(Asst.Prof. Institute of Indian and Foreign Languages MGM University

Chht.Sambhaji nagar,Aurangabad)cell-9871762286

ڈاکٹر محمد ساجد عالم (اسسٹنٹ پروفیسر ایم جی ایم یونیورسٹی)

جدیدیت کی فکری جڑیں: چند مباحث

اس باب میں جن معنوں میں جدیدیت کی تعریف اور اس کی فکری بنیاد کی بازیافت کرنے کی سعی کی جارہی ہے اس کی بنیاد ''انجمن پنجاب' کے تحت حالی اور آزاد اگرچہ بہت پہلے رکھ چکے تھے تاہم ان کی جدید شاعری کی اساس میں ادبی نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں تھی بلکہ اس میں ادب سے کہیں زیادہ سیاسی اور سماجی شعور کی کارفرمائی ہے۔ حالی اور آزاد نے اردو میں جدید شاعری کے تحت جن موضوعات اور اسلوب کو برتا وہ ایک خاص سیاسی، سماجی اور اخلاقی سیاق و سباق کے پیشِ نظر تھی۔ جو نوآبادیاتی نظام کے تحت موجودہ انگریزی حکومت اور عوام کے مابین ایک پل کا کام کر رہی تھی۔ اس ضمن میں ''انجمن پنجاب'' کے اغراض و مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جب کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت، اردو شاعری میں ابھرنے والا ایسا قوی رجحان تھا جو فرد اور ذات کے اظہار کے وسیلے سے عصری حقائق کی ترجمانی کا قائل تھا اور حقیقت کو معروضی حوالوں سے مزین کر کے اسے من عن پیش کرنے کے خلاف۔ موضوع کی حیثیت اور تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ہندوستان میں جدیدیت کی ابتدا بہت بعد میں ہوتی ہے۔ مغرب میں جدیدیت کا آغاز انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے ہوتا ہے اور انیسویں صدی نصف تک آتے آتے اپنا کام کر چکنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ جب کہ ہندوستان میں جدید ادب کا آغاز انیسوی صدی کی ساتویں دہائی سے علی گڑھ تحریک اور انجمنِ پنجاب کے بعد انیسویں صدی آخر میں اقبالؔ، چکبستؔ وغیرہ سے ہوتا ہے۔ تاہم ۱۹۶۰ء سے ابھرنے والی جدیدیت کا پس منظر علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب سے مختلف ہے۔ عالمی پیمانے پر دو عالمی جنگیں، سائنسی ایجادات، صنعتی انقلاب اور ہندوستانی پس منظر میں تقسیم ہند کے باعث ہونے والے فرقہ وارانہ فساد اور جدید نوآبادیاتی نظام کے دیر پا اثرات اردو ادب میں جدید ادب کا محرک بنے۔ 1960 کی جدیدیت کے ڈانڈے اگرچہ حالی اور آزاد سے جا ملتے ہیں تاہم

خالص ادبی مقاصد سے مفقود اس وقت کی جدید شاعری کا اطلاق بیسویں صدی کی جدیدیت پر نہیں کیا گیا۔ انجمنِ پنجاب کے بعد رومانوی تحریک نے علی گڑھ تحریک کی مقصدیت کی نفی ضرور کی اور اسے رومان اور انبساط سے قریب کیا لیکن اصل میں ترقی پسند تحریک کے اشتراکیت اور ادب برائے زندگی کا نعرہ ۱۹۶۰ء کی جدیدیت کے وجود میں آنے کے اسباب میں ایک سبب بنی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کے وہ شعرا جو جدیدیت کا حصہ بنے ان کے سامنے جدیدیت کی کوئی ایک مستحکم روایت اور اس کے اغراض مقاصد موجود نہیں تھے جس کا اطلاق وہ اپنی جدید شاعری کے باب میں کرتے۔ بلکہ یہ ایک طرح سے مختلف فکری اور تخلیقی عناصر کے تحت وجود میں آنے والا رجحان تھا جس کی حیثیت کسی منظم تحریک یا تنظیم کی نہیں بلکہ ایک آزاد فرد اور فن کار کی سی تھی۔ تاہم موضوع اور اسلوبیات کی سطح پر ان کے اجتماعی تخلیقی رجحان نے بڑے زور وشور کے ساتھ اسے 'ادب برائے ادب' کے فریم میں فٹ کرنے کی کوشش ضرور کی۔ جدیدیت محض ادبی جمالیات یا اسلوبیات کی سطح پر تجربوں سے عبارت نہیں تھی بلکہ اس میں ادب کے ساتھ دوسری جہتوں کے تغیر پذیر عناصر بھی شامل تھے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں۔ ''اخلاقی ضابطوں کے لحاظ سے ایک انقلابی تبدیلیوں کا دور ہے، جس نے حساس لکھنے والوں کو اپنی صورتِ حال کی عکاسی کا ایک نیا راستہ دکھایا، نئے اسالیب اختیار کیے گئے اور اجتماعی، سماجی اور سیاسی تجربوں کی تعبیر کا ایک نیا دروازہ کھلا۔ سماجی حقیقت نگاری کے روایتی تصور اور تاریخ کی جدلیات پر یقین رکھنے والوں کی رسمی وضع کے برخلاف سماج، سیاست اور تخلیقی تجربے کے گنجلک رشتوں کو سمجھنے کی نئی کوششیں سامنے آئیں۔''[۱]

اردو ادب میں جدیدیت کو پھلنے پھولنے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور دیکھتے دیکھتے نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک کارواں بنتا گیا۔ اس لیے کہ جدیدیت ادب میں جس ادبی نقطۂ نظر کی زور و شور سے وکالت کر رہی تھی اسے ایک حد تک ۱۹۴۰ء کے آس پاس سے حلقۂ اربابِ ذوق تحریک دیے ہوئے تھی۔ اس لیے جدیدیت نے نظریاتی طور پر حلقہ کی بجائے ترقی پسند تحریک کی پر زور مخالفت کی۔ اور جدیدیت چونکہ اپنے ساتھ کچھ نیا پن لے کر وجود میں آئی تھی اس لیے وہ فن کار جو حلقہ سے وابستہ تھے، جدیدیت کے بھی حمایتی بن گئے۔ اگرچہ جدیدیت کوئی تحریک نہیں تھی اس لیے ان کا کوئی منشور نہیں تھا تاہم 'ادب برائے ادب' کے تعلق سے ان کا نظریہ بہت واضح تھا اور اس نظریے کی کسوٹی میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر خلق ہونے والے ادب کھرا نہیں اتر رہا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے ترقی پسند تحریک کی مخالفت کی۔ تخلیقی سطح پر جدیدیت کی فکری بنیاد اظہارِ ذات، فن کار کی

آزادی، فن پارے کے قدر کا تعین، اور فن پارے کی خود کفیل ہونے کی مدلل کاوش پر مبنی ہے۔ شاید اسی لیے تخلیقی اظہار کے ضمن میں، حقیقت کے ظاہری پس منظر کے متوازی وہ حقیقت کو حسیاتی، نفسیاتی، اور جمالیاتی سطح پر اپنے داخل سے دریافت کرتے ہیں۔ ۲؎ آل احمد سرور جدیدیت کے پس منظر اور اس کے مفہوم کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیدہ کردہ مسائل کے لئے کچھ لوگوں نے ایک فلسفیانہ بشریت کا سہارا لیا۔ کچھ نے ایک طرح کی وجودیت کا اور کچھ نے ایک طرح کے نئے ہیومنزم کا۔ مگر یہ سب نے محسوس کیا کہ انسانیت کے درد کا درماں صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے پاس نہیں ہے۔ انسان کو ایک عقیدے، ایک لنگر، ایک سمت اور میلان کی ضرورت ہے۔ اور گو ایسا میلان مذہب اور فلسفہ اب بھی دے سکتا ہے مگر اس کے دلوں میں جا گزیں کرنے کے لئے ادب کے راستے فاقہ زدہ جذبات کی سیرابی کا سامان کر کے لفظ کے علامتی استعمال سے اس کا جادو جگا کر دو تہذیبوں کے خلیج کو پر کیا جا سکتا ہے اور انسانیت کے لیے نشہ اور نجات دونوں کا سامان بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔''۳؎

فلسفیانہ بشریت اصل میں جدیدیت کا وہ مطمحِ نظر ہے جسے انہوں نے ادب اور آرٹ میں اچھوتے ڈھنگ سے پیش کیا۔ اس فلسفا یانہ بشریت یا فردیت پسند فلسفے کی بیاد پر ہی جدیدیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ جس کے تحت اس نے احساس، تخیل، وجدان حسیاتی ادارک جیسے بنیادی ادبی اور فنی عناصر کو تنقید کا موضوعِ بحث بنایا۔ شمس الرحمن فاروقی جدیدیت کے سربراہوں میں ہیں، جدیدیت کی زمانی ترتیب اور جدیدیت کی فکری بنیاد کے تعلق سے وہ اپنے ایک مضمون ''نئی شاعری: ایک امتحان'' میں رقم طراز ہیں۔

''۱۹۵۵ کے پہلے کے ادب کو میں نیا نہیں سمجھتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ۱۹۵۵ کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ سب نئی شاعری کے زمرہ میں آتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ ۱۹۵۵ کے پہلے کے ادب میں ''جدیدیت'' کے عناصر نہیں ملتے ہیں۔ میری اس تعیّن زمانی کی حیثیت صرف ایک reference کی ہے۔ داخلی اور معنوی سطح سے میں اس شاعری کو ''جدید'' سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساسِ جرم، خوف تنہائی، کیفیت انتشار، اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن، اور احساسِ بے چارگی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کی خوفناک احساسِ گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔''۴؎

جدیدیت صرف اپنے موضوع ہی نہیں بلکہ اظہار اور ابلاغ کی سطح پر بھی نئے پن کا قائل تھا۔ اظہار کے تحت انہوں نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر شاعری میں ہئیت کے تجربے کیے اور ابلاغ کی سطح پر علامت نگاری اور ابہام کو اہمیت دی۔ جدیدیت کے شعرا پر ترقی پسندوں یا کسی تحریک سے غیر وابستہ ناقدین نے فن پارے کی افہام و تفہیم میں حائل علامت نگاری، گاڑھے گاڑھے تشبیہات و استعارات کے استعمال پر سخت تنقید کی ہے تو انہیں نکات کو جدیدت نے ترقی پسندوں کی مخالفت کا ایک بڑا سبب قرار دیا۔ جدیدیت، ادب کے خطیبانہ طریقِ اظہار کی سخت مخالف ہے۔ اس نہج پر ان کا نظریہ تو یہ ہے کہ وہ شعر و ادب کے ان لوازمات کو واپس لوٹا کا کام کر رہے ہیں جنہیں ترقی پسندوں نے شعر و ادب کو اپنے بندھے ٹکے مقصدیت کی حصولیابی کے لیے خطیبانہ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ فن پارے کی اشکال پسندی دراصل ان کے نزدیک حسنِ ادب ہے۔ اس لیے کہ فن کار کا ذہن اور دل دماغ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کسی واقعے یا حادثے کا اثر ہر ایک فرد پر ہو سکتا لیکن جب اس کا اظہار ہوگا تو فن کار اس واقعے کا اثر اپنے اندر جذب کر کے اسے واضح انداز میں بیان نہیں کرے گا۔ اس کے لیے وہ علامت نگاری اور تشبیہات و استعارات کو وسیلہ بناتا ہے۔ اظہار میں تفریق کی یہی نوعیت جدید شاعر اور جدید شاعری کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی فن پارے کی تفہیم اور نئی شاعری کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

'' جو چیز میرے خیال میں نئے کو پرانے سے ممیز کرتی ہے وہ تخلیقی عمل کے نظریے کا اختلاف ہے۔ نیا شاعر نظم یا شعر کو ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے تخلیق کرتا ہے، وہ ہئیت کے ان روایتی اصولوں کا قائل نہیں جنہیں ترقی پسندوں نے مشہور و مقبول کیا تھا اور جن کی رو سے نظم یا شعر میں فکر جذبہ کا منطقی استدلال و تدریج نمایاں اور واضح ہونا چاہئے۔ نیا شاعر نظم یا شعر کو کسی ایک نقطۂ وقت کی شدت میں جنم دیتا ہے، اور اس نقطۂ وقت کی منطق اس کی اصل منطق ہوتی ہے۔ نیا شاعر ہر اس اسلوب اور طرزِ اظہار کو روایتی سمجھتا ہے جو تعمیم general isation کو راہ دے۔ اسی وجہ سے نیا شاعر سڈول، ڈھلی ہوئی، سلیس شاعری کا مخالف ہے۔ اس کا طرزِ اظہار لامحالہ کچھ کھردرا اور غیر متوقع ہوتا ہے۔'' ۵؎

شمس الرحمن فاروقی طرزِ اظہار کے باب میں جو باتیں کہہ رہے ہیں اصل میں اس کا محرک بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کی اس مجہول رومانوی تحریک کی ذیلی تحریکیں یعنی ڈاڈا ازم، سرئیلزم، شعور کی رو، علامتیت اور تجریدیت وغیرہ ہے۔ ۶؎ اس رو سے دیکھیں تو جدیدیت نے

فکری ابہام اور انفرادیت پسند داخلیت کے اظہار کے لیے جو اسالیب وضع کیے اس میں مغربی ادب کے اثرات موجود ہیں۔ جدیدیت موضوع اور ہئیت کی پابندی سے انحراف کرتا ہے تا کہ فن کار کو آزادانہ اظہار کا موقع ملے۔ یہی انحراف کا رویہ ہئیت کے تجربے اور شعور کی رو کو تحریک دیتا ہے۔ ترقی پسندیوں سے اختلاف کی بنیاد میں اسالیب اور ہئیت زیادہ اہم ہیں۔ جدیدیت کوئی بات واضح طور پر کہنے سے گریز کرتا ہے اس لیے کہ اس میں انہیں ادبیت مفقود نظر آتی ہے۔ اسی کے پیش نظر جدیدیت نے علامتی اظہار پر زور دیا۔ لیکن ان کا یہ علامتی اظہار اکثر اوقات فن پارے کی تفہیم میں اشکال پیدا کرتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ جدیدیت نے ایسے ادیبوں کو دانستہ طور پر شہرت اور توجہ دینے کی بھرپور کوشش کی جن کی تخلیق سے کوئی معنی خلق کرنا تو دور قاری کا افہام و تفہیم کی سطح تک بھی رسائی حاسل کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ یہ ایک طرح سے آگ میں بھگانے اور پانی میں سکھانے کا عمل تھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے جدیدیت ادب میں آفاقی قدروں کی بجائے ادبی جمالیات پر زور دیتا ہے۔ ان کے نزدیک فن پہلے ہے اور باقی چیزیں بعد میں۔ اور اس عمل میں ادب کی جمالیاتی اقدار کی بازیافت میں سابقہ تخلیقی اصول سے انحراف کا بھی رویہ شامل ہے۔ بقول شمیم حنفی۔

"جدیدیت ایک معنی میں انسانی تجربوں اور اظہار کی ان نالہ بندیوں کے خلاف ردعمل اور برہمی کا اظہار بھی تھی جن کا قصوروار ہم سماجی حقیقت نگاری کے عالمی مفسروں کو ٹھہراتے ہیں۔'' ۷

سماجی حقیقیت نگاری کے مفسروں کے زمرے میں ترقی پسند تحریک بھی شامل ہے۔ اس کی مخالفت کا جواز جدیدیت کے یہاں نان کمٹمنٹ ادبی تخلیق کا نظریہ تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ جدیدیت نے صرف ترقی پسندوں کی ہی نفی کی بلکہ انہوں نے ولی سے لے کر جگر تک جیسے روایت پسندوں اور حالی سے لے کر راشد تک اولین جدید شعرا کی بھی نفی کی۔ ۸

جدیدیت کی تخلیقی فکر کی جڑیں کن تبدیلیوں سے وابستہ تھیں اسے ذیل کی سطروں میں دیکھا جا سکتا۔

''جدیدیت پسند تخلیق کاروں کے ہاں آزادی کا ایک بے مہار تصور تھا وہ اپنی ذات کو ہی آئیڈیل اور معیار مانتے تھے اور کسی بھی قسم کی پابندی کو اپنے لیے نا قابلِ برداشت تصور کرتے تھے۔ چاہے یہ پابندی ہئیت کی ہو یا مواد کی، سماجی ذمہ داری کی ہو یا روایت کی۔ وہ زندگی کو بے مصرف، بے مقصد اور کارِ زیاں سمجھتے تھے۔ ان کے کردار بے نام، بے چہرہ بلکہ محض پرچھائیاں تھے جو کسی پلاٹ کے پابند نہ تھے۔'' ۹

یعنی کہ جدیدیت کی فکری جڑیں کسی ٹھوس حقائق یا اصول پر پر قائم نہیں تھی۔ اس کی وجہ

ماضی کی شاندار ادبی روایت اور یا موجودہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی اندیکھی کرنا ہوسکتی ہے۔گوکہ جدیدیت کا ادبی نقطۂ نظر عصری مسائل کے پیش نظر ماحولیات کے تغیر سے جنم لینے والے عناصر کو داخلیت کا جز خاص بنا کر علامتی اور استعاراتی لبادے میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔جدیدیت کے باب میں اس طرح کے جملے کثیر الجہات کی روشنی میں کہے گئے ہیں۔مثلاً 'جدیدیت والوں کا زندگی کو بے مصرف، بے مقصد اور کارِ زیاں سمجھنا' جس سیاق میں گیا ہے اس کے لیے جدیدیت کی فکری جڑوں میں شامل تمام تر نکات اور نفسیات کی باز یافت ضروری ہے۔جو ایک علیحدہ موضوعِ بحث کا تقاضہ کرتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جدیدیت کے وجود میں روایت سے بغات اور تخلیقی عمل میں شدت پسندی غالب تھی۔اور اسلوبیات کی سطح پر ان کے تجربوں نے شاعری اور افسانے میں پیچیدگی اور ابہام کی کیفیت پیدا کی۔ یہ ایک طرح سے سہل پسندی اور نظریاتی ادب کے خلاف انفرادیت کی شناخت قائم کرنے کی کوشش میں شدید ردِ عمل تھا۔

حواشی: 1۔شمیم حنفی، جدیدیت اور اردو شاعری، مشمولہ: ادبی تحریکات و رجحانات، مرتب: انور پاشا، (جلد اول)، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۔ ۶۲۰

2۔ روش ندیم، صلاح الدین درویش، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص۔ ۶۳

3۔ آل احمد سرور، ادب میں جدیدیت کا مفہوم، مشمولہ: ادبی تحریکات و رجحانات، مرتب: انور پاشا، (جلد اول)، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۔ ۵۳۸

4۔ شمس الرحمن فاروقی، لفظ و معنی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، اکتوبر، ۱۹۶۸ء، ص۔ ۱۲۶

5۔ ایضاً، ص۔ ۱۲۸

6۔ روش ندیم، صلاح الدین درویش، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص۔ ۴۹

7۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور اردو شاعری، مشمولہ: ادبی تحریکات و رجحانات، مرتب: انور پاشا، (جلد اول)، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۔ ۶۲۱

8۔ روش ندیم، صلاح الدین درویش، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص۔ ۶۷ 9۔ ایضاً، ص۔ ۶۶

☆☆☆

Deccan par Farsi Saqafat ke Asaraat: ek tajziyati mutala by
Saidurrahman (Research Scholar, dept. of Persian,JNU, New Delhi)
سعید الرحمن (ریسرچ اسکالر، شعبہ ءفارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

دکن پر فارسی ثقافت کے اثرات: ایک تجزیاتی مطالعہ

تاریخ اپنے دامن میں زمانے کے تمام واقعات، حادثات اور حالات کو محفوظ رکھتی ہے۔ جو کچھ آج وقوع پذیر ہوتا ہے، وہ کل تاریخ کے صفحات پر جگہ پاتا ہے، اور اسی طرح انسان ماضی سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ تخلیق کے آغاز سے لے کر آج تک بے شمار واقعات رونما ہوئے ہیں، لیکن وہی واقعات اور حادثات دنیا کے سامنے آسکے ہیں جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہوئے ہیں۔

فارسی ثقافت کی بھی ایک نہایت قدیم تاریخ رہی ہے لیکن اس ثقافت کی سب سے اہم خصوصیت اس کا قدیم ہونا نہیں، بلکہ اس کی اہمیت اور حیثیت تاریخ میں اس وجہ سے زیادہ نمایاں ہے کہ اس نے نہ صرف خود کو پر عظمت اور باوقار بنایا بلکہ پورے عالم کو اپنے فضل سے سیراب کیا۔ ہندوستان کی ثقافت اور خاص طور پر دکنی ثقافت نے بھی فارسی ثقافت سے فیض حاصل کیا ہے اور اپنی اہمیت کو مزید روشن کیا ہے۔

دکن علم وفن کا مرکز اور ایک علم کا جہاں ہے، یہ ہندوستان کی تاریخ میں اتنا غنی اور قیمتی ثقافت کا حامل ہے کہ اس کے ہم پلہ معدودے چند ہی ملتے ہیں۔ یہ دکنی ثقافت کا فیض تھا جس کی بدولت مختلف علوم کے ماہرین اور فاضلین نے اس سرزمین کو اپنی پناہ گاہ اور علم وعمل کا مرکز بنایا۔ تاریخ انسانیت میں کچھ مقامات ایسے ہیں جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں، دکن بھی انہی میں شامل ہے۔

دکن کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کا آغاز دراصل دکن سے ہوتا ہے، اور اسی لیے دکنی ثقافت ہندوستان کے دیگر علاقوں کی ثقافتوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی اور اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے جب ہم اس سرزمین کی تاریخ و ثقافت کی جڑوں کی تحقیق کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس وسیع وعریض زمین کی تاریخ سے مختصر

طور پر واقفیت حاصل کریں۔ڈاکٹر نجمہ صدیقہ دکن کے بارے میں لکھتی ہیں:

''The span of time (A.D. 1518-1687) happened to be a period of most eventful history in India and in the contemporary world around. It has been the post-da Gaman period. As Vasco da Gama had landed on the there commenced a traffic of Indian soil by A.D. 1498, sea-farers between the West and the East which resulted in the diffusion of various cultures at a large scale. Persian being the medium of expression, business transactions of all these voyagers were made in Persian which eventually became a lingua franca. A Persian of this type had its own role in the coastal Golconda and even at the capital.''

"یہ دور (1518-1687 عیسوی) ہندوستان اور دنیا کے دیگر حصوں میں تاریخ کے سب سے اہم اور واقعات سے بھرپور ادوار میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دا گاما کے بعد کا عہد تھا۔ چونکہ واسکو دا گاما 1498 عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تھا، اس کے بعد مغرب اور مشرق کے درمیان سمندری راستوں کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں مختلف ثقافتیں بڑے پیمانے پر پھیل گئیں۔ فارسی جو اس وقت ایک اظہار کا اہم ذریعہ بن چکی تھی، ان تمام مسافروں کے تجارتی معاملات کا زبان بنی اور آخر کار ایک مشترکہ زبان (لنگوا فرینکا) کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس نوعیت کی فارسی نے ساحلی گولکنڈا اور دارالحکومت میں اپنی الگ شناخت بنائی اور ایک اہم کردار ادا کیا۔"

بحوالہ: Persian Language and Literature in Golconda by Najma Siddiqua

دکن ایک سنسکرت لفظ ہے جس کا مطلب جنوب ہے۔ دکن کی جغرافیائی حیثیت ایک ایسی سرزمین کی ہے جو پورے جنوبی ہندوستان کے خطے کو شامل کرتی ہے جو جنوبی سلسلہ کوہ وندیا اور دریائے نربدا کے درمیان واقع ہے، جو شمالی اور جنوبی ہندوستان کے درمیان قدرتی حد بندی کا کام دیتا ہے۔

علی اصغر حکمت اپنی کتاب" سرزمین ند" میں لکھتے ہیں:

"قدیم لوگ جنوبی ہندوستان کے جزیرہ نما کو ایک خود مختار خطہ سمجھتے تھے اور اسے دکن کے نام سے جانتے تھے، جو سنسکرت میں جنوب کے معنی میں آتا ہے۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۴۵ ۷ پر وہ مزید بیان کرتے ہیں:

"جنوبی حصہ یا جزیرہ نما ہندوستان کو سنسکرت میں دکسینا کہا جاتا تھا، جو بعد ازاں دکن کے طور پر معروف ہوا۔"

دوسری طرف ادب میں دکن کو خاص طور پر اسی علاقے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جہاں بہمنی سلطنت یا وہ حکومتیں حکمرانی کرتی تھیں جو بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد قائم ہوئیں۔ جیسا کہ محمد قاسم فرشتہ اپنی مشہور کتاب" تاریخ فرشتہ "میں" دکن" کو اس علاقے کے طور پر استعمال کرتے ہیں جو بہمنی حکومت کے تحت تھا۔ دکن کے قدیم تین اہم علاقے مہاراشٹرا، کرناٹک اور تلنگانہ آندھرا تھے؛ جو آزادی کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے قیام کے ساتھ دکن کے مغربی حصے سے الگ ہو گئے اور یہ علاقہ چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پروفیسر مجید صدیقی کہتے ہیں:

"یہ تقریباً وہی علاقہ ہے جو سولہویں صدی میں کاکتیہ سلطنت کے زیر اثر تھا۔ یہ علاقہ مسیحیت کے عہد سے قبل ہی قدیم لوگوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ جغرافیائی طور پر یہ وسیع ہے، شمال میں اڑیسہ کے نچلے حصوں سے لے کر جنوب میں چتر علاقے تک، اور مغرب میں کوہیر اور کولاس سے لے کر مشرق میں ساحل ماسولی پٹنم تک پھیلا ہوا ہے۔"

دکن کی فنون و ثقافت پر فارسی زبان اور تہذیب نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دکن ایک ایسا ثقافتی اور سیاسی مرکز ہے جہاں مقامی اور فارسی اثرات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، خاص طور پر مختلف دکن سلطنتوں کے عہد میں جیسے بہمنی سلطنت اور اس کے بعد کی سلطنتیں، مثلاً بیجاپور، گلکندا اور برار کے فنون، فن تعمیر اور فکری منظرنامے میں فارسی ثقافت کا اثر عمیق طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہ مضمون اس بات کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ فارسی جمالیات، تکنیکوں اور خیالات نے کس طرح مقامی روایات کے ساتھ امتزاج کر کے منفرد فنون کا ایک دھارا قائم کیا، جس نے دکن کے فنون کو نئی شکل دی۔ دکن کی سلطنتوں کا آغاز 1482 عیسوی میں بہمنی سلطنت کے سقوط کے بعد ہوا۔ اس سلطنت کے ٹوٹنے کے نتیجے میں بیجاپور، گلکندا، برار اور احمد نگر جیسی چھوٹی ریاستوں کی تشکیل ہوئی، جنہیں فارسی یا ترک نسل کے حکمرانوں نے قائم کیا۔ یہ حکمران اپنے ساتھ فارسی ثقافت کے اثرات لائے، جو

دکن کے فنون، فن تعمیر، ادب اور انتظامی ڈھانچے میں گہرے طور پر راسخ ہو گئے۔

فارسی ثقافت کا دکن میں پھیلاؤ نہ صرف جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے تھا، بلکہ اس کی سلطنتوں کا صفوی سلطنت کے ساتھ تجارتی تعلقات بھی تھا، اور فارسی ثقافت کو شان و شوکت اور قوت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ دکن کی سلطنتوں نے اپنی ثقافتی شناخت کو مضبوط کرنے کے لیے فارسی روایات کو اپنایا، جو ان کے درباروں اور فنون کی زبان اور علمیتشہیر کا ایک اہم حصہ بن گئیں۔

فارسی اثرات کا سب سے اہم نمونہ دکن کے فن تعمیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دکن کا فن تعمیر فارسی عظمت اور مقامی ہندوستانی روایات کا شاندار امتزاج تھا۔ فارسی فن تعمیر کی خصوصیات جیسے بڑے گنبد، پیچیدہ موزیک اور زیور سے مزین طاق دکن کی عمارات میں نمایاں ہو گئیں۔ یہ عناصر مقامی طرز کے ساتھ یکجا ہو کر ایک خاص فن تعمیر کی شکل دیتے ہیں۔

اس امتزاج کا سب سے مشہور نمونہ بیجاپور میں گول گنبد ہے، جو سلطان محمد عادل شاہ کے دور میں 17 ویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ گول گنبد کا گنبد دنیا کے سب سے بڑے گنبدوں میں سے ایک ہے، جو بغیر کسی ستون کے کھڑا ہے، یہ فارسی فن تعمیر کی ماہر تخلیق کا مظہر ہے۔ گنبد کا ڈیزائن اور تزئیناتی عناصر فارسی اثرات کی عکاسی کرتے ہیں، تاہم ان عناصر کو مقامی سیاق و سباق کے مطابق ڈھالا گیا ہے جہاں فارسی و ہندوستانی اجزاء کو ایک منفرد اور ہم آہنگ ساخت میں ضم کیا گیا ہے۔

فارسی اثرات کا ایک اور نمایاں نمونہ دکن میں فارسی باغات کا تصور ہے۔ فارسی باغات کی خوبصورتی اور ہم آہنگی نے مقبرے اور درباروں کے اردگرد ایک خاص فضاء قائم کی، جو آج بھی دکن کے مختلف علاقوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

دکن میں فارسی ثقافت کا اثر دیگر فنون میں بھی واضح ہے، جیسے خوشنویسی، مینی ایچر، پینٹنگ اور دستکاریوں میں، جہاں فارسی طرز کی شکلیں اور نمونے اپنائے گئے۔ دکن کی سلطنتوں نے فارسی شاعری، خاص طور پر فردسی، مولانا رومی، حافظ، سعدی اور امیر خسرو و دیگر فارسی ادیبوں کے کلام کو اپنے درباروں میں فروغ دیا، جس سے ایک ثقافتی ہم آہنگی کا آغاز ہوا۔ مجموعی طور پر، فارسی ثقافت کا دکن کے فنون پر اثر ایک نہایت شاندار ورثہ چھوڑ گیا ہے، جو نہ صرف دکن کی شناخت کو مضبوط کرتا ہے بلکہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

دکن کی تہذیب پر فارسی ثقافت کے اثرات نہایت گہرے اور دیرپا ہیں، جنہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں، جیسے سیاست، زبان، فنون، فن تعمیر اور فکری زندگی پر نمایاں اثر ڈالا۔ دکن کی

سلطنتوں کے قیام کے بعد، خاص طور پر بیجاپور، گولکونڈا، احمد نگر اور برار میں فارسی ثقافت کا اثر اپنے عروج پر پہنچا۔ فارسی حکمران اپنے ساتھ نہ صرف ایک مضبوط حکومتی نظام لے کر آئے بلکہ ایک وسیع اور گہرا ثقافتی ورثہ بھی دکن میں متعارف کرایا، جس کا اثر یہاں کی زبان، ادب، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں صاف طور پر دکھائی دیا۔ فارسی زبان نے دربار کی زبان کا درجہ حاصل کیا اور علمی و ادبی تبادلوں کا ایک نیا دور شروع کیا، جس کے نتیجے میں مقامی اور فارسی ثقافت کا حسین امتزاج وجود میں آیا۔

فارسی فنِ تعمیر نے دکن میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی، جس میں قطب شاہی مقبرے، جو فارسی اور مقامی طرزوں کے امتزاج کا ایک نمونہ ہیں۔ فارسی باغات، جو جنت کی منظر کشی کرتے ہیں، دکن میں متعارف ہوئے اور مقامی و فارسی ثقافت کے ایک سنگم کی شکل اختیار کر گئے۔ فارسی اثرات دکن کی موسیقی اور فنونِ لطیفہ پر بھی گہرے مرتب ہوئے، جہاں قوالی اور فارسی کلاسیکی موسیقی کے امتزاج نے دلیری اور جمالیات کی ایک نئی دنیا تخلیق کی۔

علاوہ ازیں، دکن کے درباروں نے فارسی شاعری، فلسفہ اور سائنسی تحقیق کو بھی فروغ دیا، جس کے باعث ایک نیا فکری ماحول وجود میں آیا۔ دکن کی فارسی ثقافت نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب میں بلکہ فارسی دنیا سے بھی اس خطے کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا، جس سے دکن کی منفرد شناخت اور ثقافتی ورثہ کو دوام ملا۔ اس ثقافتی امتزاج نے دکن کی تاریخ پر ایک گہرا اثر چھوڑا، جو آج بھی اس کے فنون، زبان اور فنِ تعمیر میں زندہ ہے۔

دکن کے حکمرانوں نے، جو اکثر فارسی یا وسطی ایشیا سے تعلق رکھتے تھے، فارسی ثقافت کو اپنے حکومتی نظام اور سماجی ڈھانچے میں یکساں طور پر شامل کیا۔ اس عمل نے ایک جدید فارسیمرکزی حکومت کی بنیاد رکھی، جس میں وزیروں، فوجی افسران اور بیوروکریٹس کا مرکزی کردار تھا۔ فارسی زبان کو حکومتی زبان کے طور پر اپنایا گیا، جس نے سرکاری امور، قانونی دستاویزات اور سفارتی تعلقات کو ایک نیا رخ دیا۔

فارسی ثقافت نے دکن کی اشرافیہ کے درمیان ایک نئی ثقافتی شناخت پیدا کی، جہاں شاعری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں فارسی روایات کا غلبہ تھا۔ فارسی دربار نے ان فنون کی بھرپور حمایت کی، جس کے نتیجے میں فارسی ثقافت کا فروغ ہوا اور درباری نظام میں ایک نیا طبقاتی ڈھانچہ تشکیل پایا۔ اس میں فارسی زبان بولنے والے نخبگان اور دانشوروں کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔

فارسی زبان نے دکن کی فکری اور سائنسی زندگی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے، جہاں

فارسی ادب کی ترویج اور فلسفیانہ مباحث کا آغاز ہوا۔ فارسی نہ صرف دکن بلکہ ایران، وسطی ایشیا اور دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ فکری اور ثقافتی تعلقات کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنی۔

دکن کی فوجی حکمت عملی بھی فارسی اثرات سے متاثر تھی، جس میں جدید جنگی تکنیکوں اور فوجی تنظیم کا استعمال شامل تھا۔ فارسی ثقافت کا اثر نہ صرف حکومتی ڈھانچے پر بلکہ دکن کے سماجی اور ثقافتی منظرنامے پر بھی گہرے اثرات رکھتا ہے جہاں فارسی کو انتظامیہ اور حکومتی زبان کے طور پر اپنایا گیا۔ سلاطین دکن نے اپنے ساتھ ایک پیچیدہ سیاسی اور انتظامی نظام متعارف کرایا جو فارسی روایات پر مبنی تھا، جس سے علاقائی حکمرانی میں استحکام آیا۔ فارسی نہ صرف حکومتی زبان بن گئی بلکہ اس نے درباروں کی ثقافت کو بھی متاثر کیا، جس میں فارسی شاعری، موسیقی اور فنون کی حمایت کی گئی۔

دکن کی سلطنتوں میں فارسی کا اثر عالمی سطح پر بھی محسوس ہوا، کیونکہ فارسی کو سفارتکاری کی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس نے دکن کو ایران، وسطی ایشیا اور عثمانی سلطنتوں سے جوڑا، جس کے نتیجے میں سیاسی، فکری اور ثقافتی تبادلہ ہوا۔ یہ اثرات نہ صرف دکن کے اندرونی سیاسی نظام بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کی حکمت عملیوں پر اثرانداز ہوئے۔

☆☆☆

Hamidi Kashmiri ki Fiction Nigari by Akhtar Ahmad Malik (Research Scholar, dept.of Urdu Sunrise University,Alwar)

اختر احمد ملک (ریسرچ اسکالر، شعبہءاردو، سنرایز یونیورسٹی، الور)

حامدی کاشمیری کی فکشن نگاری

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو فکشن کی تاریخ کافی پرانی ہے۔زبان کے فروغ میں فکشن کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ فکشن کے ابتدائی نمونوں میں اگرچہ روایتی اور رومانی انداز نمایاں ہے۔مگر جیسے جیسے ان کی فکر بالغ ہوئی وہ ملک کے عام رجحانات اور افکار سے متاثر ہوئے انہوں نے بھی اپنے فکشن میں سماجی، سیاسی، معاشی مسائل اور زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا۔خاص کر آزادی کے بعد ملک بھر نے جو زخم و درد تقسیم کے سبب جھیلا جموں وکشمیر اس سے زیادہ متاثر رہا۔ چنانچہ وہاں کے حساس فکشن نگاروں کی تحریروں میں وہ حالات اور اس کے بعد کی مسلسل کشمکش ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اگر ایک طرف کشمیر کے حسین مناظر کا لطف ہے۔تو دوسری طرف آگ خون اور دہشت کے ماحول کا کرب بھی بہر حال آزادی کے بعد فکشن نے نیا موڑ لیا ایسے فکشن نگاروں میں ایک قابل ذکر نام حامدی کشمیری ہیں۔

حامدی کاشمیری کا اصل نام حبیب اللہ ہے۔آپ ۲۹ رجنوری ۱۹۳۲ء کو سرینگر کے بہوری کدل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایم۔پی۔ہائی اسکول سرینگر سے حاصل کی۔ بی اے آنرس (فارسی) ۱۹۵۲ء میں ایس پی کالج سرینگر سے پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم اے انگریزی اور ۱۹۵۸ء میں ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی۔آپ نے ۱۹۶۶ء میں ''جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات'' پر کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اور وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔اس دوران انہوں نے کئی انعامات واعزازات حاصل کئے۔ ۲۰۰۵ء میں حامدی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ار ۲۰۰۶ء میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔اپنے تخلیقی سفر کے متعلق حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''۱۹۵۰ء کے آس پاس جب میں لکھنا شروع کیا تو بیک وقت شاعری اور افسانہ نگاری کی جانب متوجہ رہا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۱ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''عروس تمنا'' منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے میرا ایک افسانوی مجموعہ اور تین ناول چھپ چکے تھے۔ اس دوران میں تنقیدی مضامین بھی لکھتا رہا۔ دس گیارہ برسوں پر محیط ہر دور میری ادبی زندگی کا ابتدائی دور کہلایا جا سکتا ہے۔ دراصل میں اپنے تخلیقی وجود کی شناخت کی پیہم جدوجہد میں مصروف رہا۔ فکشن کے روایتی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے میں دراصل دو باتوں کو زیادہ اہمیت دیتا رہا۔ اول حقیقی زندگی کی الجھنوں کی تخیل تشکیل۔ یہ گویا خارجیت اور مقصدیت کا رجحان تھا جسے میں اپنے ذہن وفکر پر حاوی محسوس کرتا رہا اور افسانے ناول لکھتا رہا۔ میں اس مانوس راستے پر چلتے ہوئے مقبولیت اور شہرت کے فاصلے طے کرتا گیا، لیکن ۱۹۶۰ء میں مجھے شدت سے محسوس ہونے لگا کہ روایت پرستی میرا راستہ نہیں ہے۔ مجھے تو منزل طلبی کے لیے دشوار گزار اور پُر پیچ راہوں سے گزرنا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے بعد میں فکشن سے قطعی طور دست بردار ہو گیا۔'' ا؎

یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے طالب علمی کے دوران ایک شاعر اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ چونکہ ان کا پہلا افسانہ ''ٹھوکریں'' ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ ''شعاعیں'' (دہلی) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے ملک کے اعلیٰ رسائل میں شائع ہوتے گئے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''وادی کے پھول'' ۱۹۵۷ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ ''سراب'' ۱۹۵۹ء میں اور تیسرا ''برف میں آگ'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئے۔ ان افسانوں میں بیان کی شگفتگی بھی ہے اور کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی لہر بھی ان میں اکثر کشمیر کی معاشرت اور معیشت کی صحیح عکس نظر آتا ہے۔ حامدی کاشمیری کے افسانے ''سپنوں کے گھاؤ'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے عورت کی گھٹن کو کس طرح بیان کیا ہے:

''اور پھر ہم نیم تاریک سڑکوں پر چلتے رہے۔ ہم دونوں خاموش تھے پھر اس نے خاموشی توڑی تین کمروں کا سیٹ ہے اور کچن اور کرایہ ساٹھ روپئے میں اسکول سے آ کر کھانا پکاتی ہوں اور منی کو دودھ پلاتی ہوں اسکے بعد میری حالت دیکھنے کی ہے وہ ہنس پڑی کھوکھلی ہنسی۔ میں تنہا رہ جاتی ہوں اور تنہائی مجھے پریشان کرتی ہے یہاں کوئی جان پہچان کا انسان بھی نہیں۔ دل بات کرنے کو ترستا ہے میں اپنے کمرے میں ہانپتی ہوئی پھرتی ہوں خاموشی میرے اعصاب کو کچلتی ہے دیواریں قریب آ کر گھیر لیتی ہیں اور میرے سینے میں کتنی چیخیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا مجھے نیوراسس ہو گیا ہے

شاید سچ کہہ رہے ہوں عجیب گھٹن سی ہوتی ہے گھبرا کر کتاب ہاتھ میں اُٹھاتی ہوں تقریباً روز ہی نئی کتاب خریدتی ہوں اگر مجھے کتاب نہ ملے تو میں خودکشی کرلوں ہاں ہاں خودکشی بھلا زندگی میں رکھا ہی کیا ہے چھ سال سے زندگی کے بوجھ کو شانوں پر اُٹھائے پھر رہی ہوں۔ ہاشم صاحب شہید نگر میں جام فیکٹری میں کام کرتے ہیں انہیں وہاں بہت کام رہتا ہے'' ہاشم صاحب آپ کے پاس کیوں نہیں آتے''۔ وہ کو کری چھوڑ کر کیسے آئیں گے اور پھر مجھ سے زیادہ انہیں اپنی بہن زاہدہ عزیز ہے جو اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر میں حکمرانی کرتی ہے۔ ہاشم صاحب زاہدہ سے بہت ڈرتے ہیں ۔مجال ہے گھر میں زاہدہ کے حکم کی کوئی سرتابی کرے ان کے اشارے کے بغیر وہاں پتہ بھی نہیں ہلتا اور مجھ سے صرف اس لیے ناراضی ہے کہ میں یہاں نوکری کرتی ہوں، نوکری نہ کروں تو کیا کروں ہاشم صاحب مہینے کے آخر میں ڈیڑھ سو کی ڈیڑھ سو رقم زاہدہ کی ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔

ان افسانوی مجموعوں سے قبل آپ کا پہلا ناول'' بہاروں میں شعلے'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس ناول کی زبان شاعرانہ ہے اس میں انہوں نے گردوپیش کی سچی زندگی کو سادہ اور موثر طریقے میں پیش کیا ہے۔ بہاروں میں شعلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''اس ناول میں زندگی کے وسیع تر پہلو آ گئے ہیں اور حامدیؔ صاحب کو اپنے فن کے خدوخال دکھانے کا موقع کھل کر ملا ہے۔'' ۲؎

دوسرا ناول'' پگھلتے خواب'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ مظہر امام نے'' پگھلتے خواب'' پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

'' پگھلتے خواب'' حامدی کاشمیری کا سب سے اچھا ناول ہے اس ناول میں کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل کا اظہار فن کارانہ پختگی کے ساتھ ہوا ہے اور ایک خاص دور کی طبقاتی زندگی کی سماجی، سیاسی اور جنسی پیچیدگیوں کی تصویریں نمایاں ہوئی ہیں۔ ناول کی دلچسپی بھی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کا تانا بانا خوبصورتی سے بُنا گیا ہے اور کردار مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی زندگی سے لیے ہوئے ہیں۔'' ۳؎

چند ہی برسوں میں اُن کے دو اور ناول ''اجنبی راستے'' ۱۹۵۸ء میں اور ''بلندیوں کے خواب'' ۱۹۶۱ء کو منظر عام پر آئے۔ ''بلندیوں کے خواب'' پر ان کو ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس ناول میں عصری رجحانات کا شدید احساس ملتا ہے۔ اس میں انسان کی بے چارگی کا فکر

انگیز پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔اس ناول میں ان کی فکر ونظر کے نہ جانے کتنے آئینے سامنے آتے ہیں، جن میں قاری اپنی نفسیاتی باریکیوں اور اپنے رومانوی ذہن کے خدوخال کی جھلک دیکھتا ہے۔

حامدی کاشمیری کی ادبی زندگی کا پہلا دور ۱۹۶۲ء پر ختم ہوجاتا ہے۔اب وہ خارج سے باطن کی طرف گامزن ہوئے فکشن سے قطعی طور پر دست بردار ہوگئے اور انہوں نے اپنی ساری تخلیقی قوتیں شاعری پر مرکوز کردی۔آپ نے ۸ فکشن کی کتابیں، ۱۰ شاعری مجموعے اور ۲۷ تنقیدی کتابیں لکھی ہیں۔کل ملا کر آپ کی ۴۵ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔حامدی اب بھی مسلسل تیزی اور گرم جوشی سے لکھ رہے ہیں اور کہیں تھکن کے آثار نہیں ملتے۔طویل تخلیقی اور تنقیدی سفر کے بعد بھی وہ تازہ دم یوں بھی فن کار کی کوئی منزل نہیں ہوتی ہر منزل اس کے لیے نئے سفر کا آغاز ہوتی ہے۔

کتابیات

۱۔کشمیر میں اُردو۔از۔پروفیسر عبدالقادر سروری

۲۔جموں وکشمیر کے منتخب اُردو افسانے۔از۔سلیم ساکل

۳۔جموں وکشمیر اُردو ادب۔از۔پروفیسر حامدی کاشمیری

۴۔جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگار۔از۔نور شاہ

☆☆☆

تسکین گروپ آف پبلی کیشن اور انجمن فروغ اردو جموں کے اشتراک سے
بیاد فاروق نازکی 2024 اعزازی تقریب کا انعقاد

تسکین گروپ آف پبلی کیشنز اور انجمن فروغ اردو کے زیر اہتمام کے ایل سہگل ہال رائٹرز کلب جموں میں معروف شاعر اور دوردرشن مرکز سری نگر کے سابق سربراہ فاروق نازکی کی یاد میں ایک ادبی تقریب کا انعقاد کیا۔تقریب کی صدارت سابق ڈپٹی کمشنر پونچھ اسلم قریشی نے کی جبکہ ایم ایل اے کولگام محمد یوسف تاریگامی مہمان خصوصی اور پروفیسر اقبال نازکی مہمان ذی وقار کی حیثیت سے موجود تھے۔ پروگرام میں استقبالیہ خطبہ سہیل کاظمی نے پیش کیا۔تقریب کے آغاز میں ڈیلی ایشین میل کے چیف ایڈیٹر رشید راحل کی تاریخ پر مبنی نئی تصنیف ''لارنس ٹو گیلانی'' کا اجراء کیا گیا۔اس تقریب میں فاروق مضطر، پروفیسر قدوس جاوید، نکہت نذر، رشید راحل، عرفان عارف، ایاز رسول نازکی کو اردو زبان و ادب، صحافت و دیگر علمی، ادبی اور سماجی میدان میں نمایاں خدمات پر فاروق نازکی ایوارڈ 2024 سے نوازا گیا۔منتظم سہیل کاظمی نے پروگرام کے انعقاد کا مقصد ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ جموں اور کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں میں جو خلا نظر آ رہا تھا اسے پُر کرنے میں یہ ایک پہل ہے۔تقریب میں جن مقررین نے فاروق نازکی کے فن، شخصیت اور شاعری پر اپنے تاثرات پیش کیے ان میں ڈاکٹر شاہ نواز نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے جموں کشمیر کے جتنے بھی بڑے شاعر ادیب دانشور نقاد گزرے ہیں ان کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ فاروق مضطر صاحب نے کہا کہ فاروق نازکی کی زندگی اور ادبی خدمات کو ہمالین ایجوکیشن مشن نئے سرے سے ترتیب دے کر خطہ پیر پنجال کے ادبی حلقوں تک پہنچانے کا کام سرانجام دے گا۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اس موقع پر کہا کہ فاروق نازکی کی شاعری اور شخصیت کو کسی ایک مذہب وملت کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا بلکہ وہ ایک افاقی شاعر و شخصیت کے مالک تھے۔مہمان خصوصی محمد یوسف تاریگامی نے سب سے پہلے سہیل کاظمی کا شکریہ ادا کیا کہ جنہوں نے اس طرح کا پروگرام انعقاد کر کے ہم سب کو ایک ساتھ بیٹھنے اور باہمی تبادلہ خیال کا موقع دیا۔اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تاریگامی نے یہ بھی کہا کہ فاروق نازکی نہ صرف اپنے عہد بلکہ انے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوں گے ان سے میرے دہرینہ تعلقات تھے وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے سب سے

بڑی بات جو تاریگامی نے کہی وہ یہ کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلایا جائے۔نئی تعلیمی پالیسی پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس سے زبانوں کو بہت نقصان بھی ہو رہا ہے۔اس موقع پر اسلم قریشی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ فاروق نازکی کی شاعری جس قدر نازک لطیف ہے اسی قدر انسانی ایسا ساتھ اور جذبات سے لبریز بھی ہے انہیں اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا گا۔اور سہیل کاظمی کے لیے کہا کہ اس طرح کے پروگرام ہم بزرگوں کے لیے ذہنی اور روحانی غذا ہے۔ پروفیسر اقبال نازکی نے منتظمین کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہمارے خاندان کی خدمات کو اور بالخصوص فاروق نازکی کو یہ خوبصورت خراج عقیدت پیش کیا۔اوتار موٹا نے ان کی انسان دوستی پر بات کی جبکہ ایاز رسول نازکی نے کشمیری نظم کی صورت میں فاروق نازکی کو خراج عقیدت پیش کیا،ممبئی سے تشریف لائے ان کی بیٹی رابعہ نازکی نے اپنے بچپن کی یادوں کو دوہرایا،تقریب کے آخر میں خالد حسین نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے فاروق نازکی کی ذہانت،قابلیت اور یادشت کے بارے میں بولتے ہوئے کہا کہ ان کا حافظہ بلا کا تھا انہیں نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بڑے بڑے شاعروں رومی اور سعدی کا کلام ازبر تھا۔اس یادگار اور خوبصورت پروگرام میں نظامت کے فرائض عرفان عارف نے بخوبی انجام دیے۔تقریب میں پروفیسر محمد ریاض احمد، فوزیہ مغل ضیا، اسیر کشتواڑی ، اسد اللہ وانی، عادل فرحت، اشوک کمار پارس،خورشید کاظمی ، احمد شناس ،مسلم وانی، جاوید راہی،عبدالقادر کنڈریا، ڈاکٹر کفایت کیفی جیسے ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

☆☆☆